نسخہ ہائے وفا

فیض احمد فیض

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

"فیض نے ایک نیا مدرسۂ شاعری قائم کیا۔
انھوں نے جس بصیرت افروز احساس، خلوص
وفنکارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے
اہم سماجی مسائل سے متعلق کرکے پیش کیا وہ
اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز
تھی اور قابل قدر تھی۔"

—— فراق گورکھپوری

"فیض کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ
انھوں نے انقلابی آہنگ پر جمالیاتی احساس
کو اور جمالیاتی احساس پر انقلابی آہنگ کو قربان
نہیں کیا بلکہ ان دونوں کی آمیزش سے ایک نیا
شعری رچاؤ پیدا کیا۔ انکی شاعری میں جو دلآویزی،
دل آسائی، نرمی اور قوتِ شفا ہے، وہ اس
عہد کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔"

—— پروفیسر گوپی چند نارنگ

"فیض احمد فیض ترقی پسندوں کے
میر تقی میر تھے۔"

—— مجروح سلطان پوری

فیض احمد فیض

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

نسخہ ہائے وفا

فیض احمد فیض

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

NUSKHAH-HAA-E-WAFA
BY
FAIZ AHMED FAIZ

Rs. 50.00

سالِ اشاعت ——— ۱۹۸۶

تعداد ——— ۱۰۰۰

قیمت ——— ۵۰ روپے

ناشر ——— محمد مجتبیٰ خاں

● ——— فون نمبر ۷۷۴۹۶۵ - ۵۲۶۱۶۲

سرورق ——— ریاض الامین

مطبع ——— پروین پرنٹرس۔ گلی شاہ تارا

● ——— اجمیری گیٹ، دہلی - ۶

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6

فیض احمد فیض — ایک جائزہ

پیدائش: سیالکوٹ، ۱۳؍فروری ۱۹۱۱ء

والد: خان بہادر سلطان محمد خان، بیرسٹر، سابق میر منشی امیر عبدالرحمان خاں والئ افغانستان، سابق سفیر دولتِ افغانستان، لندن۔

ابتدائی تعلیم: مذہبی مسجد مولوی محمد ابراہیم میر سیالکوٹی۔ درسی، اسکاچ مشن ہائی سکول، سیالکوٹ۔ انٹرمیڈیٹ: مرے کالج سیالکوٹ۔ ممتاز اساتذہ: شمس العلماء سید میر حسن (عربی)، پروفیسر یوسف سلیم چشتی (اردو) مزید تعلیم: ایم اے، انگریزی ادب، گورنمنٹ کالج لاہور۔ ایم اے عربی ادب، اورینٹل کالج لاہور

درسی اساتذہ: احمد شاہ (پطرس) بخاری، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، مولوی محمد شفیع۔

ادبی اساتذہ: ڈاکٹر تاثیر، مولینا عبدالمجید سالک، مولینا چراغ حسن حسرت، پنڈت ہری چند اختر۔

مدرسی: ایم اے او کالج امرتسر ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۰ء ہیلی کالج لاہور، ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۲ء۔

بانی رکن و سیکرٹری پنجاب شاخ، انجمنِ ترقی پسند مصنفین ہند ۱۹۳۶ء۔ مدیر: ماہنامہ ادبِ لطیف، ۱۹۳۸ء۔۴۲، پہلے مجموعۂ کلام: نقشِ فریادی کی اشاعت ۱۹۴۱ء۔ فوجی ملازمت: جون ۱۹۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۶ء۔ عہدہ: لفٹیننٹ کرنل۔ فوجی اعزاز: ایم بی ای، MBE ۱۹۴۳ء

صحافت: مدیر پاکستان ٹائمز (انگریزی روزنامہ)، امروز فروری ۱۹۴۷ء تا مارچ ۱۹۵۱ء ستمبر ۱۹۵۵ تا دسمبر ۱۹۵۸ء۔ کنوینر: حکومت پنجاب لیبر ایڈوائزری کمیٹی ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۱ء۔ نائب صدر: پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن ۱۹۵۱ء۔ رکن وفد حکومتِ پاکستان بین الاقوامی مزدور کانفرنس ILO سان فرانسسکو ۱۹۴۸ء جنیوا ۱۹۴۹ء ۱۹۵۰ء۔ رکن ایگزیکٹو کونسل عالمی امن کونسل ۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۰ء۔ گرفتاری: راولپنڈی سازش کیس مارچ ۱۹۵۱ء — ضمانت پر رہائی اپریل ۱۹۵۵ء۔ بریت: ستمبر ۱۹۵۵ء۔ صدر: اے پی پی ٹرسٹ ASSOCIATED PRESS OF PAKISTAN ۱۹۵۷ء۔ پہلے مارشل لاء میں دوبارہ گرفتاری دسمبر ۱۹۵۸ء۔ رہائی اپریل ۱۹۵۹ء۔ سیکرٹری پاکستان آرٹس کونسل لاہور ۱۹۵۹ء تا

۱۹۶۲ء بین الاقوامی لینن امن انعام ۱۹۶۲ء۔ انگلستان میں قیام ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۴ء سیاحت ممالکِ اسلامیہ، لبنان، شام، عراق، مصر، الجزائر۔ مراجعتِ پاکستان: اپریل ۱۹۶۴ء۔ پرنسپل ہارون کالج کراچی، نائب صدر حاجی عبداللہ ہارون ٹرسٹ، نائب صدر پاکستان آرٹس کونسل کراچی، ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۲ء۔ صدر پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس PNCA مشیر امورِ ثقافت وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۷ء۔ بنیادی رُکن ایفرو ایشیائی ادبی انجمن ۱۹۵۸ء۔ ایفرو ایشیائی ادبی لوٹس انعام ۱۹۷۶ء۔ مدیر اعلیٰ ایفرو ایشیائی ادبی سہ ماہی مجلہ لوٹس LOTUS بیروت ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۲ء مراجعتِ پاکستان: نومبر ۱۹۸۲ء تصانیف: (منظوم) نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہ سنگ، سروادیٔ سینا، شامِ شہرِ یاراں، مرے دل مرے مسافر، (منتخب کلام کے تراجم، انگریزی، فرانسیسی، روسی، فارسی، عربی، چیکوسلوواکیا، ہنگری، جاپانی، منگولین، بنگالی، ہندی، نیپالی اور بعض اور زبانوں میں)، نثری تصانیف: میزان (تنقیدی مضامین) صلیبیں مرے دریچے میں (خطوط) متاعِ لوح و قلم (تقاریر اور متفرق تحریریں)، مہ و سالِ آشنائی (یادیں اور تاثرات) قرضِ دوستاں (مقدمے، دیباچے اور فلیپ) زیرِ طبع: انگریزی مقالات اور امریکہ، کینیڈا اور انگلستان کی مختلف درسگاہوں میں تقاریر اور خطبات۔

* صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اُٹھ بیٹھے، ابا کے ساتھ مسجد گئے۔ نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے، درسِ قرآن سُنا، ابا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی سیر کیلئے گئے، پھر اسکول۔ رات کو ابا بلا لیا کرتے خط لکھنے کیلئے۔ اُس زمانے میں اُنھیں خط لکھنے میں کچھ دقت ہوتی تھی۔ ہم انکے سیکرٹری کا کام انجام دیتے تھے۔ اُنھیں اخبار بھی پڑھ کر سُناتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اُردو انگریزی اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ * جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہم نے بھی تک بندی شروع کر دی اور ایک دو مشاعروں میں شعر پڑھ دیے۔ مُنشی سراج دین نے ہم سے کہا میاں ٹھیک ہے تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو، مگر یہ کام چھوڑ دو۔ ابھی تو تم پڑھو لکھو اور جب تُمہارے دل و دماغ میں پختگی آجائے تب یہ کام کرنا۔ اس وقت یہ تضیعِ اوقات ہے۔ ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ جب ہم مَرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے اور وہاں

پروفیسر یوسف سلیم چشتی اُردو پڑھانے آئے جو اقبالؒ مُفسّر بھی ہیں تو انہوں نے مشاعرے کی طرح ڈالی اور کہا طرح پر شعر کہو۔ ہم نے کچھ شعر کہے اور ہمیں داد ملی۔ چشتی صاحب نے منشی سراج دین کے بالکل خلاف مشورہ دیا اور کہا فوراً اس طرف توجّہ کرو، شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ۔ گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے جہاں بہت ہی فاضل اور مُشفق اساتذہ سے نیاز مندی ہوئی۔ پطرس بُخاری تھے، اسلامیہ کالج میں ڈاکٹر تاثیر تھے، بعد میں صوفی تبسّم صاحب آ گئے۔ ان کے علاوہ شہر کے جو بڑے ادیب تھے، امتیاز علی تاج تھے، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری صاحب تھے، اختر شیرانی۔ تھے، ان سب سے ذاتی مراسم ہو گئے۔ ان دنوں اساتذہ اور طلباء کا رشتہ ادب کے ساتھ ساتھ کچھ دوستی کا سا بھی ہوتا تھا۔ کالج کی کلاسوں میں تو شاید ہم نے کچھ زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن ان بزرگوں کی صحبت اور محبّت سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی محفلوں میں ہم پر شفقت ہوتی تھی اور ہم وہاں سے بہت کچھ حاصل کر کے اُٹھتے تھے۔ * مجھے یاد ہے ہم مستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدرو بہتی تھی۔ چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا، چار طرف باغات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی بدرو اور ارد گرد کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پُراسرار منظر بن گئے تھے۔ چاند کی عنایت سے منظر کی بدوضعی چھپ گئی تھی اور کچھ عجیب ہی قسم کا حُسن پیدا ہو گیا تھا۔ جسے میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے جب شہر کی گلیوں، محلّوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا رُوپ آ جاتا ہے جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے۔ "نیم شب، چاند، خود فراموشی بام و در خامشی کے بوجھ سے چُور" وغیرہ اسی زمانے سے متعلق ہے۔ (مرزا ظفر الحسن سے ایک گفتگو، سے ماخوذ)

وہ زمانہ گورنمنٹ کالج کا سنہری دور تھا۔ بڑے بڑے نامور اساتذہ مختلف شعبوں کے سربراہ تھے پروفیسر لینگ ہارن انگریزی کے صدرِ شعبہ تھے۔ تھرڈ ایئر کے امتحان میں اُنہوں نے ہمارے انگریزی کے پرچے دیکھے۔ پرچے واپس ملے تو فیض کے پرچے پر ایک سو پینسٹھ نمبر درج تھے، کسی طالب علم نے پروفیسر صاحب سے پوچھا: ان کو ڈیڑھ سو میں سے ایک سو پینسٹھ نمبر کیسے مل گئے؟ جواب ملا: BECAUSE I COULD NOT GIVE MORE

فیض کی انگریزی دانی کے متعلق ایک نامور انگریز اُستاد کے یہ الفاظ سند رہیں گے۔

(شیر محمد حمید کی تحریر "فیض سے میری رفاقت"، سے ماخوذ)

نسخہ ہائے وفا

نقشِ فریادی

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فردِ فرد تھا

غالب

فہرس

اشعار

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست! تو کہاں ہے آج

خدا وہ وقت نہ لائے....

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرّتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا
ہجومِ یاس سے بیتاب ہو کے رہ جائے
وفورِ درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرورِ حسن سراپا نیاز ہو تیرا

طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنّا بہار کو ترسے

کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے
فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لیے بیقرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

---

(۱)

بروائے عقل و مِنہ منطق و حکمت در پیش

کہ مرا نسخۂ غمہائے فلاں در پیش است

(عُرفی)

○
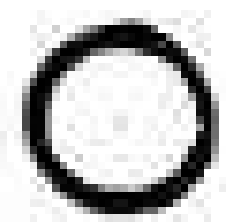
حسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منّت کشِ فسونِ نیاز

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

سوزشِ دردِ دل کسے معلوم!
کون جانے کسی کے عشق کا راز

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گم شدہ آواز

ہو چکا عشق، اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

تو ہے اور اِک تغافلِ پیہم
میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

خوفِ ناکامیٔ امید ہے فیضؔ
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

اِنتہائے کار

پندار کے خوگر کو
ناکام بھی دیکھو گے؟
آغاز سے واقف ہو
انجام بھی دیکھو گے؟

رنگینیٔ دنیا سے
مایوس سا ہو جانا
دکھتا ہوا دل لے کر
تنہائی میں کھو جانا

ترسی ہوئی نظروں کو
حسرت سے جھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو
آہوں میں چھپا لینا

راتوں کی خموشی میں
چُھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے
ملبوس کو دھو لینا

جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
بھولی ہوئی یادوں کو
سینے سے لگا لینا

انجام

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اُداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں
محبت کی دنیا پہ شام آ چکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں

مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں
تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں
تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں

سرودِ شبانہ

گُم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے

اے کہ تو رنگ و بُو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گرِ بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب
آ کہ کچھ دل کی سُن سُنا لیں ہم
آ محبّت کے گیت گا لیں ہم

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرتِ دید نا تمام رہے؟
دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسماں پر اُداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کرلیں ہم
زندگی زرنگار کرلیں ہم!

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کردے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

○

عشق منت کشِ قرار نہیں
حسن مجبورِ انتظار نہیں
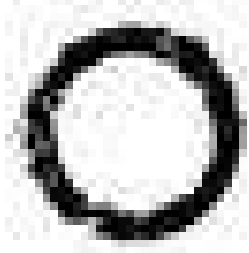
تیری رنجش کی انتہا معلوم
حسرتوں کا مری شمار نہیں

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مے باندازۂ خمار نہیں

زیرِ لب ہے ابھی تبسّمِ دوست
منتشر جلوۂ بہار نہیں

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

چارۂ انتظار کون کرے
تیری نفرت بھی اُستوار نہیں

فیضؔ زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہُوا گر وفا شعار نہیں

آخری خط

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گزر جائے گا اندوہِ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دلِ معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی
شاید مری بے سود وفاؤں پہ ہنسو گی
اس وضعِ کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہوگا
لیکن دلِ ناکام کو احساس نہ ہوگا

القصہ مآلِ غمِ الفت پہ ہنسو تم
یا اشک بہاتی رہو، فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ الفت

○
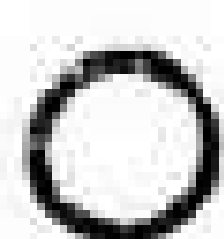
ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

دل رہینِ نیاز ہو جائے
بے کسی کارساز ہو جائے

منّتِ چارہ ساز کون کرے؟
درد جب جاں نواز ہو جائے

عشق دل میں رہے تو رُسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

لطف کا انتظار کرتا ہوں
جور تا حدِّ ناز ہو جائے

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیضؔ
کاش افشائے راز ہو جائے

حسینۂ خیال سے!

مجھے دے دے

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں!
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لیے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیائے حسن سے ظلماتِ دنیا میں نہ پھر آؤں
گزشتہ حسرتوں کے داغ میرے دل سے دھل جائیں
میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں
مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اک نظر، اک جاودانی سی نظر دے دے

(براؤننگ)

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو
ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
ترے جلووں سے بزمِ زندگی جنت بداماں ہے
مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی

مگر جانِ حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک؟
تری بے مہریوں پر جان دے گی آخرش کب تک؟
تری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر
مرے دل کی فسردہ خلوتوں میں جا نہ پائیں گی
یہ اشکوں کی فراوانی سے دھندلائی ہوئی آنکھیں
تری رعنائیوں کی تمکنت کو بھول جائیں گی
پکاریں گے تجھے تو لب کوئی لذت نہ پائیں گے
گلو میں تیری الفت کے ترانے سوکھ جائیں گے
مبادا یادہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موجہائے غم میں کھو جائیں
مرے دل کی تہوں سے تیری صورت دُھل کے بہ جائے
حریمِ عشق کی شمعِ درخشاں بجھ کے رہ جائے

مبادا اجنبی دنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو!
مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

بعد از وقت

دل کو احساس سے دوچار نہ کر دینا تھا
سازِ خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا

اپنے معصوم تبسّم کی فراوانی کو
وُسعتِ دید پہ گُلبار نہ کر دینا تھا

شوقِ مجبور کو بس ایک جھلک دکھلا کر
واقفِ لذّتِ تکرار نہ کر دینا تھا

چشمِ مشتاق کی خاموش تمنّاؤں کو
یک بیک مائلِ گفتار نہ کر دینا تھا

جلوۂ حسن کو مستور ہی رہنے دیتے
حسرتِ دل کو گنہگار نہ کر دینا تھا

سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سُو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دنیا سراب ہے گویا

سو رہی ہے گھنے درختوں پر!
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا رُوئے حسیں

—

اشعار

وہ عہدِ غم کی کاہشہائے بے حاصل کو کیا سمجھے
جو ان کی مختصر روداد بھی صبر آزما سمجھے

یہاں وابستگی، واں برہمی، کیا جانیے کیوں ہے؟
نہ ہم اپنی نظر سمجھے نہ ہم اُن کی ادا سمجھے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

تمھاری ہر نظر سے منسلک ہے رشتۂ ہستی
مگر یہ دور کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے

نہ پوچھو عہدِ الفت کی، بس اک خوابِ پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لائے نہ دل کا مدّعا سمجھے

قطعات

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

—

فضائے دل پہ اُداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اُترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدّعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

اِنتظار

گزر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں
ریاضِ زیست ہے آزردۂ بہار ابھی
مرے خیال کی دنیا ہے سوگوار ابھی
جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اُداس آنکھیں تری دید کو ترستی ہیں

بہارِ حسن، یہ پابندیٔ جفا کب تک؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک؟

قسم تمہاری بہت غم اُٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٔ صبر و شکیب، آجاؤ
قرارِ خاطرِ بیتاب، تھک گیا ہوں میں

تہِ نجوم

تہِ نجوم، کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجومِ شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی
خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بُنِ مُو سے
رواں ہو برگِ گلِ تر سے جیسے سیلِ شمیم
ضیائے مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نسیم

دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے

اُداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں
دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں

تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کسی کا حسن ہے مصروفِ انتظار ابھی

کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں
ہے ایک گُل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

—

حسن اور موت

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغِ نور ہو جس سے فضائے رنگیں میں
خزاں کے جور و ستم کو نہ جس نے دیکھا ہو
بہار نے جسے خونِ جگر سے پالا ہو
وہ ایک پھول سماتا ہے چشمِ گلچیں میں

ہزار پھولوں سے آباد باغِ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے

کئی دلوں کی امیدوں کا جو سہارا ہو
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو
جہاں میں آکے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو
نہ قحطِ عیش و مسرت نہ غم کی ارزانی

کنارِ رحمتِ حق میں اسے سلاتی ہے
سکوتِ شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی
طواف کرنے کو صبحِ بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے

تین منظر

تصوّر

شوخیاں مضطر نگاہِ دیدۂ سرشار میں
عشرتیں خوابیدہ رنگِ غازۂ رخسار میں
سرخ ہونٹوں پر تبسّم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

سامنا

چھنتی ہوئی نظروں سے جذبات کی دنیائیں
بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، تمنائیں
کچھ الجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

رخصت

فسردہ رخ، لبوں پر اک نیاز آمیز خاموشی
تبسّم مُضمحِل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بے کسی تھی تیری پُر تمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں

سرود

موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا

ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا

عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی
گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا

ساقیا رنج نہ کر جاگ اُٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اُٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

بیش قیمت ہیں یہ غمہائے محبت مت بھول
ظلمتِ یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا

یاس

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصّہ ہائے فکر و عمل!
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم
زحمتِ گریہ و بُکا بے سود
شکوۂ بختِ نارسا بے سُود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزُول
بند ہے مدّتوں سے بابِ قبَول
بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم

نقشِ فریادی
۴۰

بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بےکسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ الفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے

—

آج کی رات

ج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے

اور کل کی خبر کسے معلوم؟

دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود

ہو نہ ہو اب سحر، کسے معلوم؟

زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات

ایزدیت ہے ممکن آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

نقشِ فریادی

۴۲

اب نہ دُہرا فسانہ ہائے الم
اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اُتار دے دل سے
عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

○
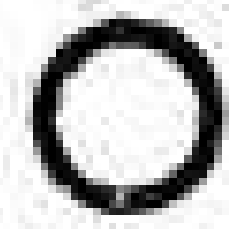
ہمّتِ التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی

اِک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی

تیری چشمِ الم نواز کی خیر
دل میں کوئی گِلا نہیں باقی

ہو چکا ختم عہدِ ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی

ایک رہگزر پر

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرّتیں پنہاں
وہ حسن جس کی تمنّا میں جنّتیں پنہاں
ہزار فتنے تہِ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں
شباب، جس سے تخیّل پہ بجلیاں برسیں
وقار، جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں

ادائے لغزشِ پا پر قیامتیں قرباں
بیاضِ رُخ پہ سحر کی صباحتیں قربان
سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم
وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اِترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے
وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہارِ لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش
گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے
غرض وہ حسن جو محتاجِ وصف و نام نہیں
وہ حسن جس کا تصوّر بشر کا کام نہیں
کسی زمانے میں اس رہگزر سے گزرا تھا
بصد غرور و تجمّل، اِدھر سے گزرا تھا

اور اب یہ راہگزر بھی ہے دلفریب و حسیں
ہے اس کی خاک میں کیفِ شراب و شعر مکیں
ہوا میں شوخیٔ رفتار کی ادائیں ہیں
فضا میں نرمیٔ گفتار کی صدائیں ہیں
غرض وہ حسن اب اس رہ کا جزوِ منظر ہے
نیازِ عشق کو اک سجدہ گہ میسر ہے

—

○
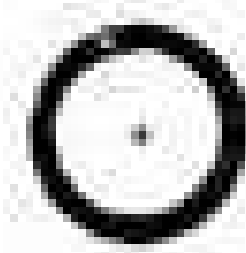
چشمِ میگوں ذرا اِدھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

تیز ہے آج دردِ دل ساقی
تلخیِ مے کو تیز تر کر دے

جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی
چاکِ دامن کو تا جگر کر دے

میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے

لُٹ رہی ہے مری متاعِ نیاز
کاش وہ اس طرف نظر کر دے

فیضِ تکمیلِ آرزو معلوم!
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

ایک منظر

بام و در خامشی کے بوجھ سے چُور
آسمانوں سے جُوئے درد رواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خوابگاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لَے رُبابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں

میرے ندیم!

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنونِ عشق کی ہمّت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم؟

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظِر راہیں
وہ پاسِ ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں
وہ انتظار کی راتیں، طویل تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں، وہ مخملیں باہیں
کہانیاں تھیں، کہیں کھو گئی ہیں، میرے ندیم

نقشِ فریادی
۵۰

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
اُلجھ رہے ہیں پُرانے غموں سے روح کے تار
چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبّتوں کے مزار
محبّتیں جو فنا ہو گئی ہیں میرے ندیم!

—

(۳)

"دِلے بقند و ختم جانے خریدم"

(نظامی)

مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم

ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم

خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے

اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ

○
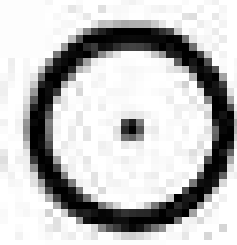
دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھُولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

سوچ

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے
کیوں خاموش رہا کرتا ہوں
چھوڑو میری رام کہانی
میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

میرا دل غمگیں ہے تو کیا
غمگیں یہ دنیا ہے ساری
یہ دُکھ تیرا ہے نہ میرا
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

غم ہر حالت میں مہلک ہے
اپنا ہو یا اور کسی کا
رونا دھونا، جی کو جلانا
یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سُکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا

—

○
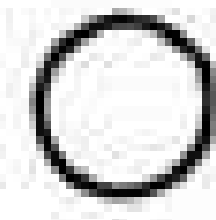
وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے رُوٹھے تو تھے، لیکن اس قدر بھی نہیں

برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حسن
گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں

نہ جانے کس لیے اُمیدوار بیٹھا ہوں
اِک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی اتنے بے خبر بھی نہیں

یہ عہدِ ترکِ محبّت ہے کس لیے آخر
سکونِ قلب اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

رقیب سے!

آکہ وابستہ ہیں اُس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سُود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہُوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہُوئے منڈلاتے ہُوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سُراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

○
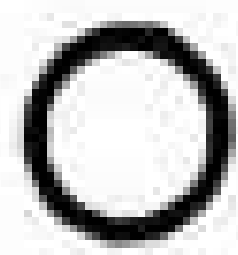
رازِ اُلفت چھُپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

وہ مِرے ہو کے بھی مِرے نہ ہُوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

فیضؔ تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

○
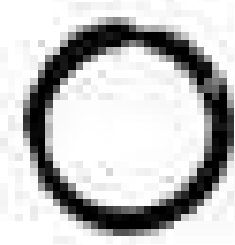
کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِّ کریم ہے تو تری رہگزر میں ہے

ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصوّرِ شام و سحر میں ہے

کیا جانے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب
وہ غم جو میرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے

○
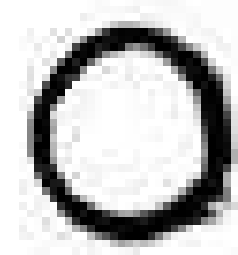
پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے
تھی، مگر اتنی رائگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے
تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے
ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے
نہ گئی تیری بے رُخی نہ گئی
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے
فیضؔ ہوتا رہے جو ہونا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم

اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رولیں

اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں

فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں

ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں

اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

—

مرگِ سوزِ محبّت

آؤ کہ مرگِ سوزِ محبّت منائیں ہم
آؤ کہ حسنِ ماہ سے دل کو جلائیں ہم
خوش ہوں فراقِ قامت و رخسارِ یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم
ویرانیِ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم
پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم

۷

سُلجھائیں بے دلی سے یہ اُلجھے ہُوئے سوال

واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم
پھر دل کو پاسِ ضبط کی تلقین کر چکیں

اور امتحانِ ضبط سے پھر جی چرائیں ہم
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختمِ عاشقی کے فسانے سُنائیں ہم

—

کُتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتّے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ اُن کا
جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مرجانے والے

یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساسِ ذلّت دلا دے
کوئی اِن کی سوئی ہُوئی دُم ہلا دے

بول...

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

—

○
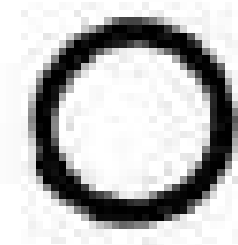
پھر لَوٹا ہے خورشیدِ جہانتاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگزر سے

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِ نظر سے

ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

—

اقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزلخواں گزر گیا
سُنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا

اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لَے سے سینکڑوں لذّت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لا زوال
اس کا دفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوّالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یا شمعِ بزم صبح کی آمد سے بے خبر

O
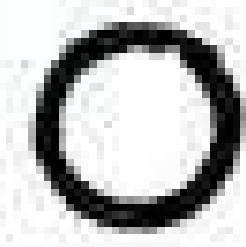
کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں، جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بُوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

—

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہُوئی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی
آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے؟
ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا!
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہُوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

—

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گُل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہُوئے اکتائے ہُوئے
حُسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہُوئے لپٹائے ہُوئے

غایتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال

تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اِک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

—

شاہراہ

ایک افسردہ شاہراہ ہے دراز
دُور اُفق پر نظر جمائے ہُوئے
سرد مٹّی پہ اپنے سینے کے
سرمگیں حسن کو بچھائے ہُوئے

جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محوِ خیال
وصلِ محبوب کے تصوّر میں
مو بمُو چور، عضو عضو نڈھال

○
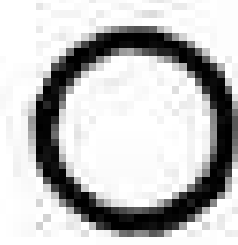
نصیب آزمانے کے دن آ رہے ہیں
قریب اُن کے آنے کے دن آ رہے ہیں

جو دل سے کہا ہے، جو دل سے سُنا ہے
سب اُن کو سنانے کے دن آ رہے ہیں

ابھی سے دل و جاں سرِ راہ رکھ دو
کہ لُٹنے لٹانے کے دن آ رہے ہیں

ٹپکنے لگی اُن نگاہوں سے مستی
نگاہیں چرانے کے دن آ رہے ہیں

کلثوم کے نام

عُنوانات

اِبتدائیہ

ایک زمانہ ہُوا جب غالب نے لکھا تھا کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی دیدۂ بینا نہیں بچوں کا کھیل ہے۔ اگر غالب ہمارے ہمعصر ہوتے تو غالباً کوئی نہ کوئی ناقد ضرور پکار اُٹھتا کہ غالب نے بچوں کے کھیل کی توہین کی ہے، یا یہ کہ غالب ادب میں پروپیگنڈا کے حامی معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کی آنکھ کو قطرے میں دجلہ دیکھنے کی تلقین کرنا صریح پروپیگنڈا ہے۔ اس کی آنکھ کو تو محض حسن سے غرض ہے اور حسن اگر قطرے میں دکھائی دے جائے تو وہ قطرہ دجلہ کا ہو یا گلی کی بدررَو کا، شاعر کو اس سے کیا سروکار! یہ دجلہ دیکھنا دکھانا حکیم، فلسفی یا سیاست دان کا کام ہوگا شاعر کا کام نہیں ہے۔

اگر ان حضرات کا کہنا صحیح ہوتا تو آبروئے شیوۂ اہلِ ہُنر رہتی یا جاتی، اہلِ ہنر کا کام یقیناً بہت سہل ہو جاتا۔ لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے فنِ سخن (یا کوئی اور فن) بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے تو غالب کا دیدۂ بینا بھی کافی نہیں، اس لیے کافی نہیں کہ شاعر یا ادیب کو قطرے میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے۔ مزید براں اگر غالب کے دجلہ سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو ادیب خود بھی اسی دجلہ کا ایک قطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے اَن گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رُخ، اس کے بہاؤ، اس کی ہیئت اور اس کی منزل کے تعیّن کی ذمّہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑتی ہے۔

یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اُس پہ فرض ہے۔ گردوپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنّی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔

اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدّوجُہد چاہتے ہیں۔

نظامِ زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہُوا، سنگ بستہ، مقیّد پانی نہیں ہے، جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔ دور دراز، اوجھل دشوار گزار پہاڑیوں

ہیں برفیں پگھلتی ہیں، چشمے اُبلتے ہیں، ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہم کنار ہوتے ہیں، اور پھر یہ پانی گھٹتا بڑھتا، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے انسانی تاریخ میں زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے اُس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے۔ پھر شاعر کی نگاہ ان گزشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچ بھی گئی۔ لیکن ان کی منظر کشی میں نطق و لب نے یاوری نہ کی یا اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے جسم و جاں جُہد و طلب پر راضی نہ ہوئے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سُرخرو نہیں ہے۔

غالباً اس طویل و عریض استعارے کو روزمرّہ الفاظ میں بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدّ و جُہد کا ادراک، اور اس جدّ و جُہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔

فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدّ و جُہد اسی جدّ و جہد کا ایک پہلو ہے۔

یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لیے طالبِ فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔

اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق و استطاعت پر ہے۔ لیکن کوشش میں مصروف رہنا ہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔

یہ چند صفحات بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہیں۔ ممکن ہے کہ فن کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کے مظاہرے میں بھی نمائش یا تعلّی اور خود پسندی کا ایک پہلو نکلتا ہو۔ لیکن کوشش کیسی بھی حقیر کیوں نہ ہو، زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری پر فائق ہے۔

سنٹرل جیل حیدرآباد
۱۶ دسمبر ۱۹۵۲ء

فیض

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالمِ پیر دگر بارہ جواں خواہد شد
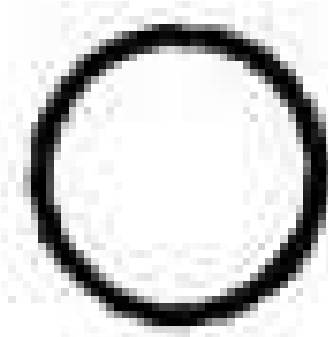
(حافظ)

○

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اے دلِ بیتاب ٹھہر!

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز

مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی

ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں

لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو

اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو

جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی

یہ گرانباریٔ آداب بھی اُٹھ جائے گی

خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے
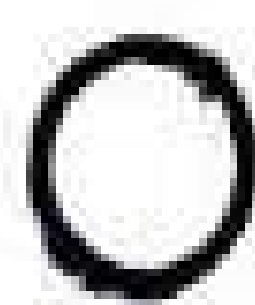
کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی، وہ قُربتیں سی، وہ فاصلے سے

کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آ کے رُکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی، وہ سارے عنوان وصال کے سے

نگاہ و دل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی
وہ جب ملے ہیں تو اُن سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے سے

بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سبک تر، کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے

تمھیں کہو رند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آ کے بیٹھے ہیں میکدے میں وہ اُٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہُوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے!

مرے ہمدم، مرے دوست

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اُداسی، ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر مرا حرفِ تسلّی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہُوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دُھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے

دستِ صبا
۱۸

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست!
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے، شیریں،
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیّاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبّت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفّاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گلچیں کے لیے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے

یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر
پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

صبحِ آزادی

اگست ۴۷ء

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بُلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سُبک سُبک تھی تمنّا، دبی دبی تھی تھکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

دست صبا
۲۲

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

لوح و قلم

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیٔ ایّام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے

دستِ صبا

۲۴

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت ہے، تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

○
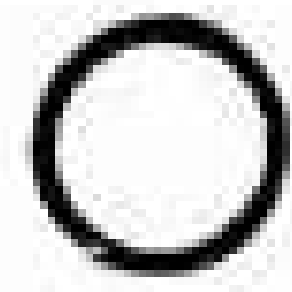
نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے اُن اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

○
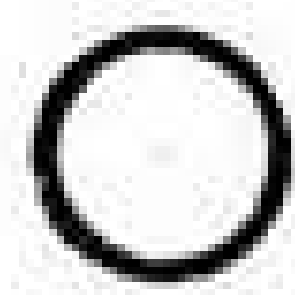
صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

شورشِ بربط و نَے

پہلی آواز

اب سعی کا امکاں اور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لیے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے
شیرینیٔ لب، خوشبوئے دہن، اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیٔ دل، تفریحِ نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں اُلجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری ہے

دوسری آواز

ہستی کی متاعِ بے پایاں، جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اِس بزم میں اپنی مشعلِ دل، بسمل ہے تو کیا، رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اِک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایّام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گُل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیٔ کاکل و لب، شاداب و حسیں گلگشتِ نظر
مقسوم ہے لذّتِ دردِ جگر، موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اِس دیدۂ تر کا شکر کرو، اس ذوقِ نظر کا شکر کرو
اِس شام و سحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو

پہلی آواز

گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمران شمس و قمر کا کیا ہوگا
رعنائیِ شب کا کیا ہوگا، اندازِ سحر کا کیا ہوگا
جب خونِ جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اِس دیدۂ تر کا کیا ہوگا، اِس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے، نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اِس کلکِ گہر کا کیا ہوگا
جب کُنجِ قفس مسکن ٹھہرا، اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گُل، اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دُوسری آواز

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اِس خوں میں حرارت ہے جب تک
اِس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نُطق میں طاقت ہے جب تک
اِن طوق و سلاسِل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورشِ بربط و نَے
وہ شورش جس کے آگے زبُوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کَے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل بھرپور خزینہ ہمّت کا
اِک عمر ہے اپنی ہر ساعت، امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علَم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

—

دامنِ یوسف

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر، وضعِ تکلّف تو دیکھیے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اِک بار سُوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے!
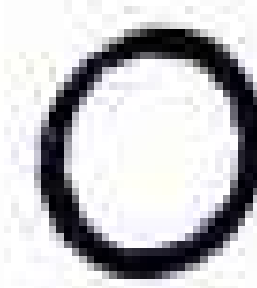
○

پھر حشر کے ساماں ہُوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جُرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

طوق و دار کا موسم

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

دستِ صبا

۳۲

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دُکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمھارے، تمھارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گُل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

○
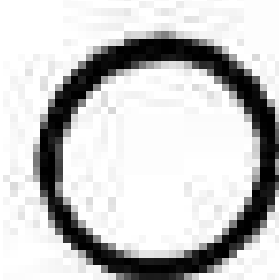
ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

سرِ مقتل

(قوّالی)

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنّا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل، جمالِ رُوئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اُٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صلا آتو چکے محفل میں اُس کوئے ملامت سے
کسے روکے گا شورِ پندِ بے جا ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اُجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

○
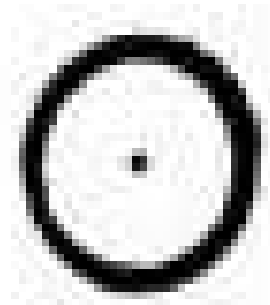
تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گُلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

○
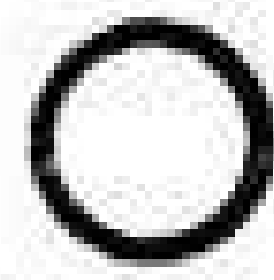
تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں
حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں
ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں
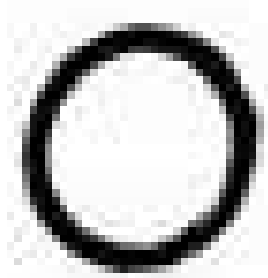
۳۸

○

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

○
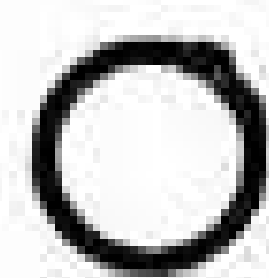
شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے

کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے، نہ دن کو ابر آئے

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

تمہارے حُسن کے نام....

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام
بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کہیں جو قامتِ زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساطِ غزل جب ڈبو لیے دل نے
تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام!

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریٔ عروسِ سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام!

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

○
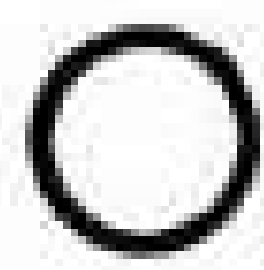
عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

بزمِ اہلِ طرب کو شرماؤ
بزمِ اصحابِ غم کی بات کرو

بزمِ ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمتِ چشمِ نم کی بات کرو

ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی
تم ستم یا کرم کی بات کرو

دستِ صبا

۴۶

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

گویا اس سوچ میں ہے دل میں لہو بھر کے گلاب
دامن و جیب کو گلنار کروں یا نہ کروں

ہے فقط مرغِ غزلخواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمیٔ گفتار کروں یا نہ کروں

—

دو عشق

(۱)

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیٔ گلفام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہُوئے ایّام
وہ پھُول سی کِھلتی ہُوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہُوا اُمّید کا ہنگام

اُمّید کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہُوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدّر

دستِ صبا
۴۸

اِس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اُس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگِ حنا کی
اِس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اُس راہ پہ پھولے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لَو تیر سی سینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

(۲)

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

اُس جانِ جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی، کبھی رو رو کے پکارا
پورے کیے سب حرفِ تمنّا کے تقاضے
ہر درد کو اُجیالا، ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

دستِ صبا

۵۰

اِس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

—

○
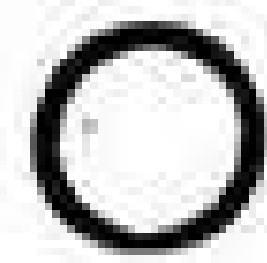
گرانیٔ شبِ ہجراں دوچند کیا کرتے
علاجِ درد ترے درد مند کیا کرتے

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کُو بکُو دلبر
اِنھیں پسند، اُنھیں ناپسند کیا کرتے

ہمیں سے رُوک لیا پنجۂ جنوں ورنہ
ہمیں اسیر یہ کوتہ کمند کیا کرتے

جنھیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے
وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند، کیا کرتے!

○
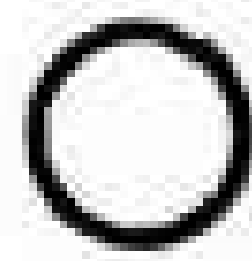
وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اِک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہی ہے مطلعِ ماہِ تمام کہتے ہیں

دست صبا
۵۴

یہ یوں کہ مفت لگادی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

فقیہہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن
کھلے نہ پھول، اسے انتظام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیضؔ، اب نہیں سرِ دار
وہ فرقِ مرتبۂ خاص و عام، کہتے ہیں

○
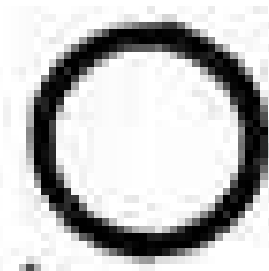
رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گُل ہے تمھارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

کیا کروں بھائی، یہ اعزاز میں کیونکر پہنوں
مجھ سے لے لو مری سب چاک قمیصوں کا حساب
آخری بار ہے، لو مان لو اِک یہ بھی سوال
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوسِ جواب
آکے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گزشتہ کی کتاب

۱۸- جولائی ۵۲ء

ایرانی طلبہ کے نام

جو امن اور آزادی
کی جدّوجُہد میں کام آئے

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن،
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی ہیں

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتوں کی "بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟"

"اے پوچھنے والے پردیسی!
یہ طفل و جواں

اُس نور کے نورس موتی ہیں
اُس آگ کی کچّی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن

اور صبح ہُوئی من من، تن تن،
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجاں،
جگ مگ جگ مگ، رُخشاں رُخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!"

○
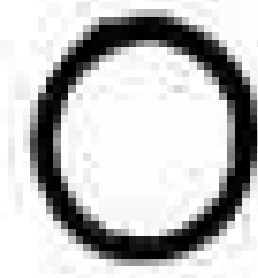
دل میں اب یوں ترے بھُولے ہوُئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوُئے کعبے میں صنم آتے ہیں

ایک اِک کر کے ہوُئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

رقصِ مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوُئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اُٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں، مائل بہ کرم آتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گذرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دُکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

اگست ۱۹۵۲ء

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوُئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوُئے تو ہیں

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزلخواں ہوُئے تو ہیں

ٹھہری ہوُئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پَرافشاں ہوُئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا، کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لُٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں

اہلِ قفس کی صبح چمن میں کھُلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت، مگر خونِ پا سے فیضؔ
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

نثار میں تیری گلیوں کے......

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ[1] و خشت مقیّد ہیں اور سگ آزاد

---

[1] سنگ ہا را بستند و سگاں را کشادند (از شیخ سعدی)

۶۶

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدّعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصوّرِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اِسی سبب سے فلک کا گِلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

○
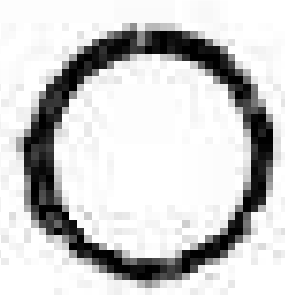
اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سُبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

بکھری اک بار تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دستِ صیّاد بھی عاجز، ہے کفِ گلچیں بھی
بُوئے گُل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہو گی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

۷

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اُترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
اُن شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

دست صبا
۴۲

نا داری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمھاری عزّت کا
وہ جس سے تمھارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اس مال کی دُھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں، تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رُلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چُن چُن کر!
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اِک بخیہ اُدھیڑا، ایک سِیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

دست صبا
۴۷

اِس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے، یاور ہے یہاں
جو آنکھ اُٹھے، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر

کب لُوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

۷۵

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی
ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رَن پڑتا ہے
نِت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

دستِ صبا
۷۶

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اِس بازی میں بَد جاتے ہیں
اُٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اِس رَن سے بلاوے آتے ہیں

—

○
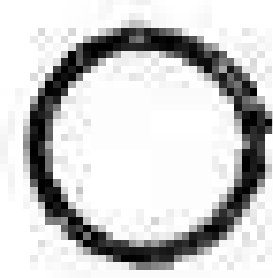
آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

ق

بامِ مینا سے ماہتاب اُترے
دستِ ساقی میں آفتاب آئے

ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

عمر کے ہر ورق پہ دل کو نظر
تیری مہر و وفا کے باب آئے

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے
نہ گئی تیرے غم کی سرداری
دل میں یوں روز انقلاب آئے

جل اُٹھے بزمِ غیر کے در و بام
جب بھی ہم خانماں خراب آئے

ق

اس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے
فیضؔ تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے، کامیاب آئے

نذرِ غالب

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بُتاں کا ارادہ رکھتے ہیں

بہار آئے گی جب آئے گی، یہ شرط نہیں
کہ تشنہ کام رہیں گرچہ بادہ رکھتے ہیں

تری نظر کا گِلہ کیا؟ جو ہے گلہ دل کا
تو ہم سے ہے، کہ تمنّا زیادہ رکھتے ہیں

۸۰

نہیں شراب سے رنگیں تو غرقِ خوں ہیں کہ ہم
خیالِ وضعِ قمیص و لبادہ رکھتے ہیں

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

جوابِ واعظِ چابک زباں نہیں فیضؔ ہمیں
یہی بہت ہے جو دو حرفِ سادہ رکھتے ہیں

—

○
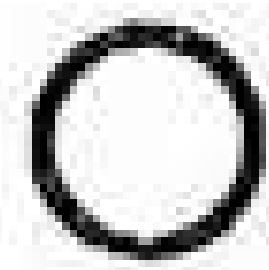
تیری صورت جو دلنشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے

حُسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے

صبحِ گُل ہو کہ شامِ مے خانہ
مدح اس رُوئے نازنیں کی ہے

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

ذکرِ دوزخ، بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

اشک تو کچھ بھی رنگ لا نہ سکے
خوں سے تر آج آستیں کی ہے

کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے

فیضؔ اوجِ خیال سے ہم نے
آسماں سندھ کی زمیں کی ہے

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

دستِ صبا
۸۴

شانۂ بام پر دمکتا ہے!
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

زنداں کی ایک صبح

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا — "جاگ سحر آئی ہے
جاگ اِس شب جو مئے خواب ترا حصّہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اُتر آئی ہے"
عکسِ جاناں کو وداع کرکے اُٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پہ

جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطحِ ظلمت سے دمکتے ہوئے ابھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراقِ رخِ محبوب کا غم

دور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضبناک، خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے

لذّتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چور صدائیں جاگیں
دور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا
دور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دور اترا کسی تالے کے جگر میں خنجر

سر ٹپکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنّاتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امّید کے جلتے ہوئے تیر

(ناتمام)

یاد

دشتِ تنہائی میں، اے جانِ جہاں، لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کِھل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور۔ افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے، اے جانِ جہاں، رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

○
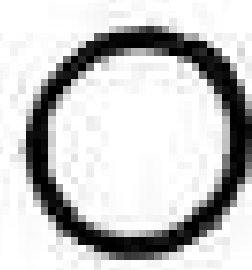
یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کُنجِ قفس بہاراں

آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں

ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں

مجرم، ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
رُوئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیمِ زُہد کر لے
سُوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں

شاید قریب پہنچی صبحِ وصال، ہمدم
موجِ صبا لیے ہے خوشبوئے خوش کناراں

ہے اپنی کشتِ ویراں، سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرو باراں

آئے گی فیضؔ اک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گساراں

○
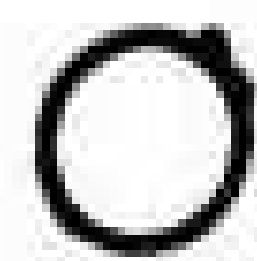
قرضِ نگاہِ یار ادا کر چکے ہیں ہم
سب کچھ نثارِ راہِ وفا کر چکے ہیں ہم

کچھ امتحانِ دستِ جفا کر چکے ہیں ہم
کچھ اُن کی دسترس کا پتا کر چکے ہیں ہم

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

دیکھیں ہے کون کون، ضرورت نہیں رہی
کوئے ستم میں سب کو خفا کر چکے ہیں ہم

اب اپنا اختیار ہے چاہیں جہاں چلیں
رہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم

ان کی نظر میں کیا کریں پھیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم

کچھ اپنے دل کی خو کا بھی شکرانہ چاہیے
سو بار اُن کی خُو کا گِلا کر چکے ہیں ہم

—

(۱)

میخانے کی رونق ہیں کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداریِ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

زنداں نامہ

مندرجات

پیش آغاز

سیّد سجّاد ظہیر

مقدمۂ "سازش" راولپنڈی کے دنوں میں فیض کے ساتھ میں بھی سنٹرل جیل (حیدر آباد سندھ) میں تھا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء تک ہمارے مقدّمے کی سماعت ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں روز روز اسپیشل ٹریبونل کے اجلاس میں جا کر ملزموں کے کٹہرے میں گھنٹوں بیٹھے رہنے اور اس دوران گواہوں کی شہادتوں، وکیلوں کی جرح اور بحث اور معزز ججوں کی فاضلانہ قانونی موشگافیوں سے نجات مل گئی تھی۔ ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور ہم امید و بیم کے عالم میں تھے۔ یہ چھٹی "وافر" تھی۔ انھیں دنوں ایک دن یہ خبر ملی کہ "دستِ صبا" شائع ہو گئی۔ گو ہم اس کی تمام چیزیں فیض کے منہ سے سُن چکے تھے اور انھیں بار بار پڑھ چکے تھے، لیکن اس خبر سے ہم میں سے تمام قیدیوں کو جو ادب سے مَس رکھتے تھے، ایک غیر معمولی مسرّت ہوئی۔ جیل کے حکام سے اجازت لے کر ہم نے ایک پارٹی بھی کر ڈالی جس میں ہم تمام قیدیوں نے مل کر فیض کو "دستِ صبا" کی اشاعت پر مبارکباد دی۔ اس موقع پر منجملہ اور باتوں کے میں نے یہ کہا تھا کہ بہت

عرصہ گزر جانے کے بعد، جب لوگ راولپنڈی سازش کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مورّخ ۱۹۵۲ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالباً اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔

بہت دنوں سے لوگ، جن میں بعض نیک اندیش اور بعض بداندیش ہیں، اُردو ادب اور خاص طور پر اس کی ترقی پسند صنف پر جمود طاری ہونے یا اس کے انحطاط کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس نقطۂ نظر کو صحیح نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اُردو ادب کا جدید دور اس کے روشن ترین ادوار میں سے ہے۔ یہ دور تقریباً ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ابھی تک جاری ہے اور اگر ہم گزشتہ چار پانچ سال کو ہی لے لیں تو میرے خیال میں فیض کی "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" ندیم قاسمی کی "شعلۂ گل" سردار جعفری کی "پتھر کی دیوار" احتشام حسین کی "تنقید اور عملی تنقید" اور مجنوں گورکھپوری کی "نقوش و افکار" (منجملہ دیگر کتابوں کے) اس دعویٰ میں کافی ہیں کہ تخلیق کا سرخ شعلہ

"جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی"

ناساعد حالات میں نہ دھیما ہوتا ہے اور نہ بجھتا ہے بلکہ جہل و رجعت کی کالی آندھیاں اُسے اور بھی بھڑکاتی ہیں اور اس طرح مجاہدہ اور تصادم کے طوفانوں سے گزر کر اور اس پیکار سے قوت و حرارت حاصل کر کے حق و صداقت کا نور پہلے سے بھی زیادہ درخشاں ہو جاتا ہے اور اس کے حسن اور تاثر میں صد رنگ نئی تابندگیاں جھلملانے لگتی ہیں

"زنداں نامہ" کی بیشتر منظومات فیض نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں۔ یعنی جولائی ۱۹۵۲ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کی لکھی ہوئی

چیزیں اس میں ہیں۔ اس درمیان میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے کیونکہ ہم دونوں کو چار چار سال قید بامشقت کی سزا دینے کے بعد، اہل اقتدار نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ایک ساتھ جیل میں نہ رکھے جائیں۔ فیض کو پنجاب میں منٹگمری جیل کو بھیجا گیا اور مجھے حیدرآباد سندھ سے بلوچستان کے سنٹرل جیل مچھ کو۔ ہم ایک دوسرے سے خط و کتابت بھی نہ کر سکتے تھے۔ تاہم دوسرے دوستوں کے خطوں اور بعض اردو رسالوں کے ذریعے مجھے فیض کی چند غزلیں اور نظمیں جو اس زمانے میں لکھی گئیں، پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

اب کہ حالاتِ زندگی میرے لیے کافی خوشگوار ہیں اور میں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں، اس کے باوجود جب میں اُن ذہنی جذباتی اور روحانی کیفیات کا خیال کرتا ہوں، جو مجھ پر اس وقت طاری ہوتی تھیں جب اپنے اس محبوب ترین دوست اور ہمدم کا کلام پڑھتا تھا تو اس کا اظہار مشکل معلوم ہوتا ہے۔ شاید بے لاگ تنقید کے لیے یہ اچھا بھی نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چونکہ ہمارے بہت سے تجربے، زندگی اور اپنے وطن کو ثمربار اور حسین بنانے کے متعلق ہمارے خواب، ہمارا درد، ہماری نفرتیں اور رغبتیں، مشترک تھیں، اس لیے فیض کے ان اشعار سے میں غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا تھا۔ اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو اتنی فیاضی سے مرصع کر دیتا ہے، اور اپنی نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیتا ہے، تو کبھی میرا ذہن اس کی تخیل کی اُن شاداں اور فرحاں گل کاریوں سے کسبِ شعور کرتا جہاں جدید جدلیاتی علم کی ضیاپاشیاں، انسانیت کے شریف ترین جذبات سے اس طرح مل

گئی ہیں جیسے شعاعِ مہر سے تمازت ۔

فیضؔ کی ان نظموں کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اُن اقدار کا تعلق ہے، جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے، وہ تو وہی ہیں، جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں، لیکن فیضؔ نے ان کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدن کی بہترین روایات سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت، اس کا رزم، شیریں اور مترنم اندازِ کلام کہیں بھی ان سے جدا ہوتا ہے ۔ اُس کے متحرک اور رواں استعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی خوشبو ہے، اُس کے خیالات میں اُن سچائیوں اور ان جمہوری مقاصد کی چمک ہے جن سے ہماری قوم کی عظیم اکثریت کے دل روشن ہیں ۔ اگر تہذیبی ارتقا کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادّی اور روحانی عسرت سے نجات حاصل کرکے اپنے دلوں میں گداز، اپنی بصیرت میں حق شناسی اور اپنے کردار میں استقامت و رفعت پیدا کریں اور ہماری زندگی مجموعی اور انفرادی حیثیت سے، بیرونی اور اندرونی طور پر مصفا بھی ہو اور معطر بھی، تو فیضؔ کا شعر غالباً ان تمام تہذیبی مقاصد کو چھو لینے کی کوشش کرتا ہے میرا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب یہی ہے ۔ البتہ فیضؔ کے تمام چاہنے والے، نقشِ فریادی، دستِ صبا اور زنداں نامہ کے شیدا ہونے کے باوجود اُن سے یہ توقع اور امید رکھتے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ان کی وہ تخلیقیں جو ابھی نہیں ہوئیں، ان کے مقابلے میں، جو کہ وہ کر چکے ہیں، زیادہ گراں قدر ہوں گی ۔

لکھنؤ - ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء

سجاد ظہیر

رُودادِ قفس

سابق میجر محمد اسحاق

کیمیا گر بغصہ مردہ بہ رنج
ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

فیض صاحب کی کسی تصنیف کا دیباچہ لکھنے کی سعادت ایک خزانہ پانے سے کم کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی دقتوں کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب لکھنے بیٹھا۔ کہتے ہیں پرانے زمانے کے راجے مہاراجے جب کسی برگشتہ بخت سفید پوش کی پریشاں حالیوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے تو اسے ایک عدد ہاتھی بخش دیا کرتے تھے۔ معاملہ بعینہٖ ایسا تو نہیں ہے، لیکن ایک سیدھے سادے فوجی آدمی کے لیے فیض کے کلام کے بارے میں کچھ لکھنا کافی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے اور پھر ایک کسان اور خاص کر نوآبادیاتی ملک کے کسان کے بیٹے کی تربیت ہی کیا ہوتی ہے! دیہاتی سکولوں کی تعلیم اور وہ بھی توہم پرستی اور جہالت کے گھناونے سایوں تلے، ایسے ماحول میں جس میں غربت و ناداری کے طفیل پڑھنے لکھنے کی نسبت ہل کی لکیر سیدھی رکھنا

زنداں نامہ
۱۰

ڈھور ڈنگر کی نگہبانی کرنا اور بیلوں کے لیے چارہ لانا زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جہاں ہر نئی شے اور ہر نئے خیال کا حقارت آمیز تمسخر اُڑایا جاتا ہے، جہاں دنیا کا بلند ترین خیال اور پاکیزہ ترین جذبہ دو بیگھہ زمین کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ میرا تعلیمی پس منظر ایسا ہی تھا۔ فنونِ لطیفہ میرے اساتذہ کے بس کی بات نہیں تھے، میں ان سے مَس کیا ہوتا۔ کتابیں زندگی کا حصّہ نہیں تھیں، صرف امتحان پاس کرنے کا ذریعہ تھیں۔ لائبریریاں، علما کی محفلیں، علمی مباحثے، مشاعرے، ڈرامے، موسیقی، رقص، آرٹ گیلریاں، میوزیم سب مفقود۔ اور چاروں طرف سامراجیوں اور ان کے ملکی ایجنٹوں کے اقتصادی بوجھ تلے کراہتی ہُوئی مخلوق!

ایسی روکھی پھیکی تعلیم کے بعد آٹھ دس سال کی فوج کی مصاحب بہادری نے رہی سہی کسر نکال دی۔ وہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا۔ اور "کالا لوگ" کی دوسری زبانوں کو اپنے دیس میں ہی دیس نکالا ملا ہُوا تھا یا ان کی حیثیت انگریزی زبان کی لونڈیوں، باندیوں کی سی تھی۔ جیل کے چار سال اس لحاظ سے مفید رہے کہ یکسوئی سے مطالعہ کا موقع مل گیا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہُوا کہ دو ایک پروفیسر بھی ساتھ ہی قابو آ گئے تھے۔

زنداں نامہ کا دیباچہ لکھنے کے بہانے میں اپنی سوانحِ عمری لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی مشاہدے کی صحیح جانچ اسی وقت ہو سکتی ہے جب شاہد کے مقام اور اس کی صلاحیتوں کا پورا پورا تعین کر لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں کچھ مہینے کم چار سال دن رات فیض کے ساتھ رہا ہوں۔ یہ طویل عرصہ ہم نے جیل کے ایک ہی احاطے میں ملحقہ کوٹھڑیوں میں گزارا ہے، سیکڑوں مرتبہ صبح سویرے سب سے پہلے ایک دوسرے کے منہ لگے ہیں، اپنی خوشیاں اور غم باہم بانٹنے پر مجبور رہے۔ جیل کے باہر آدمی سیکڑوں

لوگوں کو روزانہ ملتا ہے --- ملتا نہیں، ہو دیکھ ضرور لیتا ہے۔ کئی قسم کی آوازیں سنتا ہے،
بیسیوں مناظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی سے نفرت ہے تو کنی کترا کے نکل سکتا ہے،
کسی سے محبت ہے تو ملاقات کی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے یا ان کی تلاش میں جی بہلا لیتا ہے
جیل میں آدمی کی مرضی اس سے چھین لی جاتی ہے اور اس کی نقل و حرکت محدود کر دی جاتی
ہے۔ وہاں کی کائنات دو چار قیدی، دو چار پہرے دار، کچھ کوٹھریاں اور کچھ دیواریں،
ایک آدھ درخت، ایک دو گلہریاں، نصف درجن کے قریب چھپکلیاں اور کچھ کوّے اور
دوسرے پرندے ہوتے ہیں۔ جن میں مہینوں بلکہ سالوں تک تبدیلی نہیں آتی۔ مجھے اس
چھوٹی سی دنیا میں فیضؔ صاحب کے ساتھ مسلسل چار سال تک رہنے کا موقع مل ملا ہے۔
لیکن اس طویل قُرب کے باوجود ضروری نہیں ہے کہ میں اپنے موضوع سے پُورا انصاف
کر سکوں۔ ایک اندھا کائنات کی رنگا رنگی میں عمر گزار کر بھی رنگوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔
کئی لوگ اچھی بھلی نظر رکھتے ہوئے بھی بعض رنگوں کو نہیں پہچان سکتے۔ ریڈیو پروگرام
سننے کے لیے طاقتور ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں چاہیے رسیونگ سٹ بھی نقائص سے
پاک ہونا چاہیے۔

یہاں پر زنداں نامہ کی نظموں اور غزلوں پر تنقید و تبصرہ اگرچہ میرا مقصود نہیں،
پھر بھی شاعر کے بیان میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔ فیضؔ کی لطافت کا بیان میرے بس کی
بات نہیں ہے۔ اثرؔ لکھنوی کی زبان میں "فیض احمد فیضؔ کی شاعری ترقی کے مدارج طے
کر کے اب اس نقطۂ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی
ہوئی ہو۔ تخیل نے صناعت کے جوہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشا ہے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول، ایک طلسمی فضا میں اس طرح مستِ پرواز ہے

کہ ایک پر ایک کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور قوسِ قزح کے عکاس بادلوں سے ست رنگی بارش ہو رہی ہے ......" ہر کوئی بقدرِ ظرف اس لطافت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فہم کے مطابق، چیدہ چیدہ نظموں کا پس منظر بیان کر دوں۔ اتنا خیال رہے کہ صحیح ادب اپنے پس منظر کی حدود و قیود کو توڑ کر بہت آگے نکل جاتا ہے۔ فیض کی شاعری کو اس کے پس منظر کے سانچے میں محدود کر کے دیکھنا ظلم ہے۔ اس لیے میری کاوشوں کو ایک سائن بورڈ سے زیادہ حیثیت نہیں دینی چاہیے۔ آگے راستہ سب کا اپنا اپنا ہے اور اپنی اپنی ہمت۔

فیض صاحب ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو قید ہوئے اور اپریل ۱۹۵۵ء میں رہا ہوئے۔ اس طرح ان کی اسیری کے دن کچھ اوپر چار سال بنتے ہیں۔ اس عرصہ میں وہ پہلے تین مہینے سرگودھا اور لائل پور کے جیلوں میں قیدِ تنہائی میں رہے۔ اس کے بعد جولائی ۵۳ء تک حیدر آباد (سندھ) جیل میں راولپنڈی سازش کیس کے باقی اسیروں کے ساتھ رہے۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں ہم سب کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر لاہور، منٹگمری، مچھ (بلوچستان) اور حیدر آباد کے جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ فیض صاحب کے لیے میرے اور کیپٹن خضر حیات کے ہمراہ منٹگمری سنٹرل جیل کا انتخاب کیا گیا۔ لیکن وہ چونکہ بغرضِ علاج کراچی چلے گئے تھے، اس لیے کہیں ۱۹۵۴ء میں جا کر ہمارے پاس منٹگمری پہنچے۔ یہاں سے ہم اکٹھے رہا ہوئے۔

مجھے فیض صاحب کی گرفتاری کے کوئی تین ماہ بعد مئی ۱۹۵۱ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اِس لیے خلقِ خدا کی سرگوشیاں سنتا رہا۔ فیض صاحب کے ساتھ اس دوران میں ان کے عزیزوں دوستوں کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہ ہی وہ کسی سے خط و کتابت

۱۳

کر سکتے تھے۔ ان کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں اور قید میں ان کے ساتھ سلوک کے بارے میں عجیب عجیب دلخراش قصے مشہور تھے۔ جب پہلی بار ان سے حیدرآباد جیل میں ملاقات ہوئی تو بارے اطمینان ہوا۔ وہی خندہ پیشانی وہی چمکتی ہوئی آنکھیں، وہی گوتمی مسکراہٹ جس کا نور سب طرف پھیل رہا تھا اور پھر وہ فاتحِ عالم محبت، جس سے ان کے جاننے والے مانوس ہیں۔

جیل ایک طرح کا طلسماتی آئینہ خانہ ہوتا ہے، جہاں صورتوں کے بہیں سیرتوں کے عکس عجیب و غریب شکلیں بنا کر ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی کی طبع جھگڑے کی طرف مائل ہے تو وہ ہر کسی سے لڑائی مول لینے کی فکر میں ہوگا۔ کوئی بزدل طبیعت کا ہے تو وہ گوبر کے کیڑے کی طرح ہر وقت سر چھپانے کی دھن میں ہوگا۔ کسی کے مزاج میں قنوطیت ہے تو وہ ہر اچھی بُری خبر سے اپنی دلشکنی کے اسباب ڈھونڈ لائے گا۔ کسی کو کوئی خبط ہے تو وہ دیوانگی کی حد تک ترقی کر جائے گا۔ طبیعتوں میں کمینگی اور تنگ نظری خاص طور پر پھلتی پھولتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے ساتھیوں اور جیل والوں سے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انسان کی ساری کائنات جیل کی چار دیواری میں محدود کر دی جاتی ہے اور اس کے فکر و نظر میں تنگی آجاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں پر حیوانی بندشیں عاید کر دی جاتی ہیں۔ کوٹھڑی میں بند کرنا، ایک احاطے میں محصور کر دینا، بیڑیوں کا استعمال، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات پر پابندیاں، بے بسی کا عالم، یہ سب چیزیں اسیروں کے دل پر نوکِ سوزن کا کام کرتی ہیں۔ جیل کے بعض افسر بھی قیدیوں کی دل شکنی کے مواقع ڈھونڈتے رہتے ہیں اور قیدی کی عزتِ نفس اور وقار کو

ٹھیس پہنچانے میں خاصے ماہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات سب کے بارے میں صحیح نہیں۔

ان حالات میں ایک آدمی قید ہو کر اگر اپنی روزمرّہ کی شخصیت قائم نہ رکھ سکے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کمال ان لوگوں کا ہے جو جیل جا کر بھی وضعداری قائم رکھ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو میں جیل جانے سے پہلے جانتا تھا ان میں فیض صاحب ہی ایسے تھے جو بظاہر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لیکن عام لوگوں کی طرح طبیعتوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے لڑائی جھگڑے، دنگہ فساد اور اسی قسم کے دوسرے سیفٹی ویلو (SAFETY VALVE) استعمال نہ کرنے سے فیض صاحب پر جو ذہنی اور جسمانی فشار پڑا وہ ان کے دوستوں سے مخفی نہیں۔ شاعری غنیمت تھی، جس کے ذریعے دل کا غبار نکال لیا کرتے تھے لیکن شاعری بذاتِ خود دل و جگر کے ایندھن پر چلا کرتی ہے ؎

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!

حیدرآباد میں دورانِ مقدمہ کے دن بھی عجیب دن تھے۔ تین مہینوں سے ٹوڈی قسم کے لوگ اخباروں، اشتہاروں، جلسوں، جلوسوں میں ہمیں گولی کا نشانہ بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بعض اخباروں نے غدار نمبر نکال دیے تھے۔ کچھ اس قسم کا ماحول پیدا کر دیا گیا کہ ملک میں ہر ہر آزاد یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کو بھی سازش میں دھر لیا جائے گا۔ چاروں طرف ایک دہشت اور سراسیمگی کی فضا تھی اور ہمارے رشتہ دار اور دوست ہماری جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ لیکن جیل کے اندر ہماری اپنی یہ حالت تھی کہ گویا کسی پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ سب طرف ہنسی مذاق تھا،

قہقہے تھے، امید تھی، حوصلہ تھا۔ قوالیاں ہوتی تھیں، سوانگ بھرے جاتے تھے!
اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہمیں اپنی بریت پر بھروسہ تھا اور دوسری شاید یہ ہو سکتی ہے کہ بہت بڑے خطرے کے سامنے آدمی عموماً دو ہی راستے اختیار کرتا ہے یا تو اُلٹے پاؤں بھاگ اٹھتا ہے یا مقابلے کی ٹھان لیتا ہے۔ مؤخر الذکر کی بھی آگے دو صورتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم میں بعض ایسے بھی ہوں گے جو مصائب کی ہولناکیوں کے رُوبرو لرز لرز کر ہنس رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے کہ

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ!
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یہ صورتِ حال حیدر آباد سے مخصوص نہیں تھی، لاہور کے چند روز کے قیام میں بھی ہماری یہی حالت رہی تھی۔ چنانچہ لاہور کی برڈ ووڈ بیرکس (BIRDWOOD BARRACKS) میں پولیس کی تحویل میں دیے جانے کے کوئی پانچ منٹ بعد مئی ۱۹۵۱ء میں گرفتار ہونے والے ساتوں کے ساتوں فوجی افسر، ظفر اللہ پوشنی کی قیادت میں فضول قسم کے فوجی کورس (CHORUS) الاپ رہے تھے (اس قسم کی بے ضرر لغویات کی چھوٹے فوجی افسروں کو خاص موقعوں پر اجازت ہوتی ہے) لاہور جیل کا ایک واقعہ یاد کرتا ہوں تو اب بھی ہنسی آجاتی ہے۔ وہاں ہمیں بم کیس (BOMB CASE WARD) میں رکھا گیا (یہ وارڈ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کیلئے خاص طور پر تعمیر کیا گیا تھا)۔ اس کے صحن میں ایک بارہ دری سی ہے، جس کے دروازوں میں لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی ہے۔ رات کو ہم یہیں سویا کرتے تھے۔ ایک دن سونے کی تیاری میں تھے کہ ایک بوڑھا سنتری جالی سے لگ کر اندر جھانکنے

۱۶

لگا۔ خضر حیات نے پوچھا۔ بابا تمھیں ہم قید میں دکھائی دیتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں جناب۔ خضر حیات بولا لیکن بابا ہمیں تو تم قید میں نظر آتے ہو۔ اس پر بوڑھا سنتری پہلے تو بوکھلا سا گیا۔ پھر اس زور سے ہنسنے لگا کہ ہم بھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ایک نشہ تھا جس میں سب مگن تھے۔

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

لاہور ہی کا ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک دن ہمیں ریمانڈ کے لیے عدالت میں لے جایا جانا تھا۔ اطلاع ملی کہ سیّد سجاد ظہیر بھی ساتھ جائیں گے۔ جیل کے بڑے دروازے کے اندر پولیس کی قیدی ڈھونے والی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم وہاں رک گئے اور سیّد صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں پھانسی کی کوٹھیوں کی طرف سے سفید شلوار کرتے میں ملبوس، سر پر جناح کیپ جمائے، ایک بھاری بھرکم، زندگی سے مطمئن شخص آتا دکھائی دیا۔ ہمارے درمیان چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ کیا یہ سجاد ظہیر ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے ان کے ساتھ کسی کی بھی جان پہچان نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کمیونسٹ نہایت قبیح صورت، درندہ سیرت انسان ہوتے ہیں۔ داہنے بائیں پستول لگاتے ہیں۔ پیٹ پر پیش قبض باندھتے ہیں۔ بڑی بڑی مونچھیں اور خونخوار آنکھیں رکھتے ہیں۔ اور ان کا موضوعِ سخن قتل و غارت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سجاد ظہیر چونکہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے، اس لیے ان لوگوں کے خیال میں ان کے منہ سے ہر سانس میں آگ نکلنی چاہیے تھی۔ اور ان کو اس قسم کا کائیاں انسان ہونا چاہیے تھا کہ ڈبکی لگائے تو جیل سے باہر چلا جائے۔ یہ شخص جو نرم چال،

پاکیزہ خدوخال اور ایک عدد عالمانہ توند لیے ہوئے تھا سجّاد ظہیر کیسے ہو سکتا تھا۔ ہمارے یہ ساتھی اپنی رائے پر اس شدّت سے مُصِر تھے گویا یہ ان کا جزوِ ایمان ہے۔ چنانچہ چار و ناچار ہم سب نے تسلیم کر لیا کہ یہ سجّاد ظہیر نہیں ہو سکتے، کشمیری بازار کے شیخ ہوں گے یا پولیس کے کوئی خضر صورت ایجنٹ۔ چنانچہ عدالت تک تمام سفر میں ہم گُم سُم بیٹھے ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے رہے۔ عدالت میں جب وہ کھڑے ہو کر گرجے کہ "جناب والا پندرہ دن ہو گئے ہیں اور مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا کہ میں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں۔ یہ بالکل لغو (PREPOSTEROUS) بات ہے"، تو ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ سجّاد ظہیر ہیں۔ ریمانڈ کے لیے ہمیں جج صاحب کی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا۔ وہاں پولیس گاردوں اور گاڑیوں کی اتنی گہما گہمی تھی کہ کوٹھی کی اُوپر کی منزل میں بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ضیاء الدّین نے اشارے سے مجھے بلا کر کہا، "بھئی ایسے بیٹھے ہو جیسے مویشی چرانے آئے ہو۔ سیدھے ہو کر بیٹھو۔ کالر ٹھیک کرو۔ ذرا ذرا مسکراؤ۔ دیکھتے نہیں ہو پبلک دیکھ رہی ہے۔" اور خود بھی تن کر ایسے بیٹھ گیا کہ گویا تصویر اُتروانے آیا ہو۔ ایئر کموڈور جنجوعہ سے میری پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ انھوں نے مصافحہ کرتے وقت میرے ہاتھ کو اس پھُرتی سے نچوڑا کہ اب تک یاد ہے۔

حیدر آباد میں عدالت کی عمارت جیل کے اندر تھی۔ عدالت کا وقت آٹھ سے بارہ بجے تک ہوتا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کے دن خالی ہوتے تھے۔ شام کے وقت کبھی کبھی ہمارے وکلاء مشورے کے لیے آ جایا کرتے تھے۔ باقی وقت ہمارا اپنا ہوتا تھا۔ ایک ہی احاطے میں سب کے لیے جگہ نہیں تھی اس لیے فیض صاحب، محمد حسین عطا،

زنداں نامہ

۱۸

جنرل اکبر خاں، بریگیڈیئر صادق خاں، کرنل ضیاء الدین، کرنل نیاز محمد ارباب، میجر حسن خاں
کیپٹن ظفر اللہ پوشنی، کیپٹن خضر حیات ——— اور میں ایک احاطے میں
رکھے گئے اور سید سجاد ظہیر، جنرل نذیر احمد، ایئر کموڈور جنجوعہ اور بریگیڈیر لطیف خاں کو
ایک دوسرا احاطہ دیا گیا۔ بیگم اکبر خاں کے لیے علٰحدہ انتظام تھا۔ کھانے کا بندوبست
ہماری طرف تھا۔ ہمیں ظہور احمد اور عادل خاں دو قیدی نہایت اچھا پکانے والے
ملے ہوئے تھے اور کھانے کا انتظام ایک باقاعدہ آفیسرز میس (OFFICERS
MESS) کی طرز پر تھا۔ جس کا سیکرٹری گاہے گاہے چنا جاتا تھا۔ شام کے وقت
والی بال اور بیڈ منٹن بھی ہمارے احاطے میں ہی کھیلے جاتے تھے۔ چنانچہ مشترک
سرگرمیوں کا مرکز یہی احاطہ تھا۔ مشاعرے، قوالیاں، ڈرامے عموماً یہیں ہوتے تھے۔
سید سجاد ظہیر والے احاطے میں ہم چھٹی کے دن کی صبح کو جایا کرتے تھے جہاں کافی اور
بسکٹ سے تواضع ہوتی تھی اور ادبی اور سیاسی گفتگوئیں ہوتی تھیں۔

مرزا سودا کے غنچے کی طرح فیض صاحب کی بیاض بردار ی کا کام میرے
سپرد تھا۔ جب وہ مجلس مشاعرہ کی طرف یا سجاد ظہیر کے ہاں جاتے تو میں نوٹ بک
اُٹھائے پیچھے پیچھے ہوتا۔ دوسرے رفیق جب ہمیں اس طرح جلوس میں پلتا دیکھتے تھے
تو چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس لیے کہ جیل میں فیض صاحب کے تازہ کلام
کا ورود، مسعود جشن سے کم نہیں ہوتا تھا اور پھر جس ادا سے ہم چلتے تھے، وہ بھی خوش طبعی
کی ایک اچھی خاصی مزاحیہ صورت ہوتی تھی۔ فیض صاحب خراماں خراماں مسکراتے
ہوئے، گھبرائے سے، شرمائے سے، چلتے تھے اور میں ایک لٹھ بند جاٹ کی طرح
گردن اکڑائے، ناک آسمان کی طرف اُٹھائے لوگوں کے سروں کے اُوپر سے دیکھتا ہوا

پیتا تھا اور جب تک فیض صاحب کے تشریف رکھنے پر نہایت مؤدب لیکن باوقار انداز میں بیاض ان کی خدمت میں پیش نہیں کرلیتا تھا، مسکراتا تک نہیں تھا۔ میاں غنچہ اور مجھ میں اتنا فرق ضرور تھا کہ مرزا سودا جب کسی پر ناراض ہُوا کرتے تھے تو غنچہ کو صرف قلمدان آگے بڑھانا ہوتا تھا۔ باقی میرزا خود بھگتا لیا کرتے تھے۔ یہاں یہ صورت تھی کہ فیض صاحب تو ہمیشہ سے "با دشمناں مروّت با دوستاں مدارا" کے قائل رہے ہیں اور رُو برو کسی سے ناراض ہوتے ہی نہیں اور غنچۂ ثانی اُن دنوں دوست دشمن سب کی سرکوبی کو ہر وقت مستعد رہتے تھے۔

حیدرآباد میں فیض صاحب، میں اور عطا ملحق کمروں میں رہتے تھے۔ میں اور عطا ان کے سب موڈوں سے واقف ہو گئے تھے۔ شعر کا عالم طاری ہوتا تھا تو فیض صاحب خاموش ہوجایا کرتے تھے۔ البتہ اُٹھتے بیٹھتے گنگنا چکنے کے بعد ادھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ ہم بھانپ لیتے تھے کہ سامعین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم دونوں کئی کانفرنسوں اور لگاتار سرگوشیوں کے بعد موقع کی مناسبت کا اندازہ لگا کر، گورونانک دیوجی کے بھائی بالا اور مردانہ کی طرح حضورِ شاعر پہنچ جاتے تھے اور اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد غزل یا نظم کا مطالبہ شروع کر دیا کرتے تھے کہ اب بہت عرصہ ہو گیا ہے اور لوگ کیا کہیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اگر نظم یا غزل تیار ہوتی تھی تو ایک آدھ شعر سنا دیا کرتے تھے ورنہ حکم ہوتا کہ بھاگ جاؤ۔ ہم سمجھ جاتے تھے کہ اس انکار میں اقرار مخفی ہے اور بات پھیلا دی جاتی تھی کہ

معنی کی سرزمیں پہ نزولِ سروش ہے

ان کے نواح میں شور و غوغا، دنگا فساد، لڑائی جھگڑا، حتی الامکان

۲۰

بند کر دیا جاتا تھا۔ فیض صاحب نے بہت نازک طبع پائی ہے۔ ہمسائے میں تُو تُو میں میں ہو رہی ہو، دوستوں میں تلخ کلامی ہو، یا یونہی کسی نے تیوری چڑھا رکھی ہو ان کی طبیعت ضرور خراب ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی شاعری کی کیفیت کافور ہو جاتی ہے۔ جو لوگ عطا کو اور مجھے جانتے ہیں وہ زیرِ لب مسکرا رہے ہوں گے کہ یہ حضرات جن کو شاعری دیکھ پائے تو نثر میں منہ چھپالے، فیض کی طبیعت پر کیونکر بار نہیں ہو جاتے تھے! اس کا بھید فیض صاحب ہی کھول سکتے ہیں۔

حیدر آباد میں قریباً ہر پندرھواڑے ایک مجلسِ مشاعرہ منعقد کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔ یہ مشاعرہ کبھی طرحی ہوتا تھا کبھی غیر طرحی اور سبھی کو اس میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ "دستِ صبا" میں مندرجہ ذیل مصرعوں پر کہی ہوئی غزلیں موجود ہیں:

۱ - "ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں"
۲ - "آج کیوں مشہور ہے ہر ایک دیوانے کا نام"
۳ - "دیکھنا وہ نگہِ ناز کہاں ٹھہری ہے"
۴ - "دگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں"

فیض کی غزل "وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں" حسرت موہانی کی ایک غزل پر کہی گئی ہے۔

میرے ذہن میں فیض صاحب کی جیل کی شاعری کے چار رنگ ہیں (یا موڈ کہہ لیجیے) پہلا رنگ سرگودھا اور لائل پور کے جیلوں میں ان کی تین مہینوں کی قیدِ تنہائی کا ہے۔ وہ بہت مشکل دن تھے۔ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار، خطوط سب چیزیں ممنوع تھیں۔ انھوں نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

صرف ایک شمس الدین[1] تھے جو نوابوں، جنوں بھوتوں، دیووں، پریوں، عاملوں معمولوں سے اپنے معاملات کے قصّے سنا کر فیض صاحب کا جی بہلایا کرتے تھے۔ حیدر آباد میں تو فیض صاحب ان کے ذکر سے بھرپور تھے۔ آج کل بھی اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ اس قیدِ تنہائی کا ان پر اتنا اثر ہوا تھا کہ حیدر آباد پہنچنے پر وہ اکیلا رہنے سے بہت وحشت کھاتے۔ اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے علاوہ ایک ہال بھی ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ ہمیں اجازت تھی کہ جہاں چاہیں بستر جمالیں۔ ہم اپنے اپنے کمرے میں رہنا چاہتے تھے لیکن فیض صاحب ہال میں رہنے پر مُصر تھے۔ کہتے تھے تمھیں میری طرح تنہائی میں رہنا پڑتا تو دوستوں کی صحبت کی قدر ہوتی۔ لیکن ان پر یہ حالت زیادہ دیر طاری نہ رہی اور کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اب ان کا بیشتر وقت ہمیں اپنے کمرے سے نکالنے میں صرف ہوتا تھا۔

فیض صاحب کہا کرتے ہیں کہ اُن دنوں ان کی طبیعت میں بہت زوروں کی آمد تھی اور طرح طرح کے مضامین سوجھ رہے تھے۔ اس دوران کا کلام کچھ تو ان کے ذہن سے اُتر گیا۔ جو بچ گیا وہ "دستِ صبا" میں مندرجہ ذیل مندرجات پر مشتمل ہے:

متاعِ لوح و قلم

---

[1] شمس الدین سی کلاس کے قیدی تھے جو ان کا کھانا تیار کیا کرتے تھے۔ یو۔پی کے رہنے والے تھے۔

دامنِ یوسف

طوق و دار کا موسم (پہلا حصہ)

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام

کچھ کلام ایسا بھی ہے جو صرف سینہ بسینہ چل سکتا ہے اور جس سے فیض صاحب صرف مخصوص دوستوں کو نوازتے ہیں۔

ان کی شاعری کا دوسرا رنگ حیدر آباد کا ہے۔ یہاں ہمیں ہر طرح کا جسمانی آرام جو جیل میں ممکن ہو سکتا ہے، میسّر تھا۔

"گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"

کی سی حالت تھی کہ ظاہری آرام و آسائش کے پردے میں ہزاروں حسرتوں کا خون اور لاکھوں تمناؤں کا قبرستان تھا۔ ہمارے خلاف کئی تعزیری دفعیں ایسی لگی ہوئی تھیں جن کی سزا موت تھی۔ اس کے ساتھ صفائی پیش کرنے کی سہولتیں بہت حد تک ہمیں میسّر نہیں تھیں۔ لیکن ہم نے سمجھ رکھا تھا کہ ؎

در بیاباں گر بشوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

اور وقتی طور پر شور و غوغا، ہاؤ ہو، گالی گلوچ کے ذریعے آنے والے خطرے

کی آہٹ کو دبانے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ دو سال ہمارا موضوعِ سخن صرف فتح رہا۔ سب مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے سامنے کسی نے کبھی شکست کا ذکر کیا ہو۔ ہم سمجھتے تھے کہ ایسا ذکر ایک دفعہ شروع ہو گیا تو پھر روکے نہیں رُکے گا۔ ہم فوج کے اس مشہور مقولے پر عمل کر رہے تھے کہ جب مدافعت کی صورت نہ رہے تو دھاوا بول دو۔ چنانچہ شروع دن سے ہم عدالت کے اندر حسبِ توفیق غلغلہ اندازی کرتے رہے۔ فیض صاحب نے اس میں بہت کم حصہ لیا۔ لیکن ہمیں کبھی روکا بھی نہیں۔ وہ اپنا جوش و ولولہ اپنے شعروں میں منعکس کر لیا کرتے تھے۔

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہو ثابت
وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب   وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گُل دامنی و کج کلہی

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

دیکھنے والے دیکھیں گے کہ 'دستِ صبا' کے دوسرے حصے میں جوش و خروش کا وہ عالم نہیں جو پہلے نصف میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ کچھ عرصہ مقدمہ کی سماعت ہوچکنے کے بعد ہمیں امید ہوچلی تھی کہ اگر عدالت کی کارروائی میں دلچسپی لیں تو شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس لیے سوچ بچار نے شوریدہ سری پر سبقت لے لی تھی۔ اس کی دوسری وجہ ان کے بھائی کی اندوہناک موت تھی۔ وہ حیدرآباد ان سے ملنے آئے تھے اور اپنے ایک روحانی پیشوا کی طرف سے ان کی رہائی کی خوشخبری لائے تھے۔ ابھی حیدرآباد میں ہی تھے کہ ۱۸ جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح کو نماز پڑھتے ہوئے اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ فیض صاحب کو اتنا صدمہ ہوا کہ مہینوں تک نیم مردہ حالت میں رہے۔ ایک دن تو چارپائی سے اُترتے ہوئے بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑے۔ آواز سن کر میں اور عطا بھاگے بھاگے گئے اور زمین

سے اُٹھا کر بستر پر لٹایا ۔ یہ گھاؤ ابھی تک بھرا نہیں ہے ، گو اُنھوں نے حسبِ عادت اسے کیموفلاج (CAMOUFLAGE) کر لیا ہے ۔

فیض صاحب کی کیموفلاج کرنے کی عادت بھی عجیب ہے ۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ سگرٹ ختم ہو گئے لیکن بجائے اس کے کہ ساتھیوں سے مانگ لیں ، بے قراری دور کرنے کے لیے احاطے کے چکر کاٹنے شروع کر دیے ۔ اس بے قراری کی تشخیص میں ہمیں کافی عرصہ لگا ۔ ان کو چھپکلیوں سے بہت گھن آتی تھی ۔ میرے خیال میں خوف کھاتے تھے ۔ ایک دن ہم سب برآمدے میں چارپائیاں ڈال کر سونے کی تیاری میں تھے کہ فیض صاحب نے دفعتاً اُٹھ کر اِدھر اُدھر چکر کاٹنے شروع کر دیے ۔ عطا کی چارپائی پاس ہی تھی ۔ اُس نے سوچا کہ دال میں کچھ کالا ہے ۔ ہاتھ کی طرف دیکھا تو سگرٹ سلگ رہا تھا ۔ فیض صاحب کی نظروں کا پیچھا کیا ۔ دیکھا کہ ان کی نظریں بار بار چھت کی طرف اُٹھ رہی تھیں ۔ وہ چارپائی کے پاس آتے تھے اور آگے نکل جاتے تھے اور گھوم کر یہی عمل دُہراتے تھے ۔ عطا نے چھپکلی کو دیکھ لیا اور اُٹھ کر فیض صاحب کی چارپائی کھینچ کر ایک طرف کر دی ۔

تیسرا رنگ کراچی کا ہے جہاں فیض صاحب دو ماہ کے لیے مقیم رہے ۔ دراصل یہ رنگ دوسرے اور چوتھے کی درمیانی کڑی ہے ۔ کراچی ہسپتال میں فیض صاحب جیل کی نسبت قدرے آزاد فضا میں رہے ۔ دوستوں کے ساتھ بغیر کسی قباحت کے ملاقات ہو جایا کرتی تھی ۔ وہاں انھیں بوجوہ آزادی کی نعمتوں کا شدّت سے احساس ہُوا ۔ اِس شدید احساس کے بعد جب وہ منٹگمری آئے تو قید کا

احساس بھی شدت پکڑ گیا اور ان کی شاعری میں ظاہر ہُوا۔ اسی لیے انھوں نے کراچی اور منٹگمری میں لکھی ہُوئی غزلوں اور نظموں کے مجموعے کا نام زنداں نامہ تجویز کیا ہے۔
کراچی میں فیض صاحب نے اپنی معرکۃ الآرا نظم "ملاقات" لکھی۔ اس نظم کا پہلا بند اکتوبر ۱۹۵۳ء میں منٹگمری آکر مکمل ہُوا تھا اور دوسرا اور تیسرا نومبر میں۔ اسے کراچی سے اس لیے منسوب کر رہا ہوں کہ وہ اس کے "جراثیم" کراچی سے لائے تھے۔ اس میں اس ماہئ بے آب کی تڑپ ہے جس پر جانسوز محرومی کے بعد کچھ پانی چھڑک دیا گیا ہو اور وقتی سکون کے باوجود اُسے اس بات کا شدت سے احساس ہو کہ تھوڑا سا پانی جو اسے میسر آیا ہے، سوکھنے والا ہے۔ یہ نظم درد کی انتہائی شدت کے ساتھ انتہائی تسکین کی بھی مظہر ہے۔ اس میں ایمان و ایقان کی جگمگاہٹ بھی ہے، اس میں انسانی حوصلہ، عزم اور حکمت کا راگ بھی گایا گیا ہے۔ ایسا حوصلہ، عزم اور حکمت جو صرف آج کے انسان کا طرّۂ امتیاز ہیں جو دھرتی ماتا پر نہایت مضبوطی سے قدم جما کر تاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے اور مہتاب پر شبخون مارنے کی فکر میں ہے، جو پانی، ہوا، دریا، سمندر، برق و باراں اور کائنات کی دوسری پریوں اور دیووں کو مسخر کر چکا ہے، یا ان کی تسخیر کیا چاہتا ہے، جس کی سیکڑوں، ہزاروں سالوں کی الم نصیبی اور جگر فگاری کے انبار آج اس کے لیے حرکت اور حرارت کا منبع بنے ہُوئے ہیں۔
فیض صاحب کی جیل کی شاعری کا چوتھا رنگ منٹگمری کا ہے۔ یہاں ہمیں کم و بیش حیدر آباد کی سی سہولتیں میسّر تھیں۔ جیل کے اربابِ اقتدار بھی نیک دل لوگ تھے، جو جیل کے قواعد و ضوابط سے سرمو انحراف نہ کرنے کے باوجود ہماری دلشکنی نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان میں بعض اچھے ذوق کے لوگ بھی تھے جو ہمارے ساتھ ادبی چھیڑ چھاڑ

جاری رکھتے تھے۔ ایک صاحب کو تو ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ ان کے آنے کے کچھ ہی لمحوں کے بعد فیض صاحب طوطی کی طرح چہچہانے لگتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ دشمنوں نے ان پر کم گوئی کا الزام تراش لیا ہے۔ ان صاحب کو چرکیں سے لے مرزا غالب تک سب شعرا کے کچھ نہ کچھ بھلے بُرے شعر یاد تھے اور انھوں نے تیرتھ رام فیروزپوری کے ناولوں سے لے کر سعادت حسن منٹو کی کہانیوں تک سب کچھ پڑھ رکھا تھا۔ وہ آتے ہی علیک سلیک کے بعد شروع ہو جاتے اور فیض صاحب کی طرف سے توجہ ہونے نہ ہونے کی پروا کیے بغیر یہاں سے وہاں، وہاں سے کہیں اور کچھ نہ کچھ کہتے رہتے، حتیٰ کہ فیض کی کوئی ایسی رگ چھڑ جاتی کہ غصّے میں یا موج میں آکر ان سے کچھ کہے بغیر رہا نہ جاتا۔

منٹگمری میں فیض صاحب کو اپنی بیوی، بچیوں اور دوسرے دوستوں رشتہ داروں سے ملاقات میں بھی آسانیاں تھیں۔ دل بہلاوے کے لیے ہم نے اپنے احاطے کے اندر ایک پھلواڑی بھی بنا لی تھی جس کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے سارے جیل میں پھیل گیا تھا بلکہ جیل کے باہر بھی لوگوں کو پھولوں کی پنیری مہیا کی جاتی تھی۔ فیض کو پھولوں کا شوق اتنا تھا کہ انھوں نے ولایت سے اپنی خوشدامن اور ایک دوست کے ذریعے پھولوں کے بیج منگوائے۔ پھول ایک بڑھنے پھولنے پھلنے کی چیز ہے۔ ان سے جیل میں خوب جی بہلتا ہے، اور کوئی نہ کوئی نئی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آدمی قید کا ایک ایک دن گننے کی بجائے موسم گننے لگتا ہے جو طویل سے طویل قید میں بھی اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی نظریں مستقبل کی طرف رہتی ہیں کہ آنے والے موسم میں پھول لگانے کے لیے کیا کیا بندوبست کرنا ہے اور گزشتہ غلطیوں کے اعادے سے بچاؤ کی کیا صورت ہے۔

زنداں نامہ
۲۸

لیکن ان سب باتوں کے باوجود منٹگمری میں فیض صاحب کو قید کا بہت شدید احساس تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حیدر آباد سے تبدیلی پر یاروں دوستوں سے جدائی کا بہت قلق تھا۔ ایک طرح سے بھرا گھر اُجڑ گیا تھا۔ دوسری وجہ میں بیان کر چکا ہوں کہ کراچی کے دورانِ قیام کی نسبتاً آزاد فضا کے بعد قید کا بوجھ زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ مستقبل قریب میں رہا ہو جانے کی اُمید کا جو موہوم سا چراغ اب تک جلتا رہا تھا، وہ اب خاموش ہو چکا تھا اور شروع شروع کی قیدِ تنہائی کا رنگ ایک حد تک عود کر آیا تھا۔ درد و غم کا طوفان اُمڈ پڑا تھا۔ اب وہ جیل کی دیواروں، دروازوں، سلاخوں، پہرہ داروں کو غور سے دیکھنے لگے تھے۔ پہلے باہر کی دنیا کے ساتھ تخیّل کا بلا واسطہ تعلق تھا اب اسے بھی جیل کی دیواریں پھاند کر آنا جانا پڑتا تھا ۔

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطّر آتی ہے، اشکوں سے منوّر جاتی ہے

اس شعر میں نسیمِ صبحِ وطن کی دیواروں کو پھاندنے کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی ہے اور اس کا ہجراں نصیب قیدی کو جیل والوں کی نظروں سے بچ بچا کر یادوں کا تحفہ دینا اور اس کے آنسوؤں کی سوغات لے جانا بھی نظر آ رہا ہے۔

جب تک سوہنی کامیابی سے چناب کو عبور کر کے مہینوال کو مل لیا کرتی تھی، اس وقت تک اس کے ذہن میں چناب کی لہروں اور گھڑے کی پختگی کا ایک موہوم تصور تھا۔ اس کی ساری توجہ مہینوال پر مرکوز رہتی تھی کہ وہ کیسا ہو گا، کیسے ملے گا اور رخصت کے وقت دل پر کیا گزرے گی۔ جب وہ کچے گھڑے کی بدولت

دریا میں ڈوبنے لگی، اس وقت نظریں یار کی کٹیا پر تھیں۔ لیکن کوئی وقت ایسا ضرور آیا ہوگا، جب پوری شدت کے ساتھ اس کو دریا کی ہستی کا احساس ہُوا ہوگا اور کچے گھڑے کی چکنی مٹی ہاتھوں میں محسوس کر کے پکا گھڑا بھی یاد آیا ہوگا اور جب وہ مہینوال کی خاطر اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہوگی تو ایک لمحے کے لیے مہینوال کا تصور بھی ذہن سے اُڑ گیا ہوگا۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران میں فیض کا تصور باہر کی دنیا کے ساتھ بہت مضبوطی کے ساتھ جما رہا۔ جیل کی زندگی نے یہ رشتہ اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ دستِ صبا کے آخر میں فیض صاحب کی دو حسین و جمیل نظمیں "زنداں کی ایک شام" اور "زنداں کی ایک صبح" اس پر شاہد ہیں۔ یہاں انھوں نے زنداں کے کریہہ المنظر دیو کی ہیبتناکی کا پورا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ لیکن ان کے چہرے پر تحقیر آمیز مسکراہٹ ہے اور انھوں نے مسرت و شادمانی کے ایسے ذرائع نکال لیے ہیں، جو زنداں کے عفریت کے احاطۂ قدرت سے باہر ہیں۔

دل سے پیہم خیال کہتا ہے   اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے   کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں   وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

گویا پھر خواب سے بیدار ہُوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہُوئے جناتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں

زنداں نامہ
۳۰

اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امّید کے جلتے ہوئے تیر

کراچی کے قیام کے بعد یہ طلسم ٹوٹ گیا اور منٹگمری میں جیل اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ روبرو آگیا۔ چنانچہ ان کے دردِ دل نے دنیا بھر کے اسیروں کے رنج و الم کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ کینیا کے باشندوں پر جمہوریت اور آزادی کے دعوے داروں کے ہاتھوں بے پناہ ظلم و ستم اور ان کے اپنے وطن کے مصائب فیض صاحب کے لیے سوہانِ روح بنے ہوئے تھے۔ وہ افریقی عورتوں کے کارہائے نمایاں سے خاص طور پر متاثر تھے۔ کئی دفعہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں رہے، افریقی بن گئے ہیں۔ ان کی نظم "آجاؤ ایفریقا" اس کی مظہر ہے۔

"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" روزنبرگ (ROSENBERG) جوڑے کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ یہاں وہ مرتے دم تک انسانیت کے مستقبل، انقلاب یا محبت یا ان سب کے ساتھ اپنی وفاداری جتلاتے رہتے ہیں۔ اس نظم کی آفاقیت (UNIVERSALITY) عجیب و غریب ہے۔ اس نے صدیوں کو پاٹ کر ہر زمانے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے، ہر ملک کے شہیدوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نظم کربلا، پلاسی، سرنگاپٹم، مدکی، جھانسی، جلیانوالہ، قصہ خوانی، سٹالن گراڈ، ملایا، کینیا، کوریا، تلنگانہ، مراکش، طیونس سبھی سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور طہران، کراچی اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر دم توڑتے طلبہ، مراکش، طیونس، کینیا اور ملایا کے خون میں لت پت مجاہد، سب ایک ہی جانفروز نعرہ دہراتے سنائی دیتے ہیں:

تیرے کوچے سے چن کر ہمارے عَلَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

ہم منٹگمری میں ہی تھے کہ ایرانی محبانِ وطن کو جیل میں گولی کا نشانہ بنانے کی مفصل روداد امریکی رسالہ "ٹائم" میں آئی ساتھ ہی ان کی قتل گاہ میں لی گئی تصویر بھی تھی۔ سعدی اور حافظ کے وطن سے فیض صاحب کو خاص محبت ہے۔ کئی دن مضطرب رہے اور بالآخر ان کا اضطراب "آخری رات" کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ نظم ان خیالات و تصورات کی ترجمانی کرتی ہے جو قیدی کے ذہن میں اس رات گزرتے ہیں جس کی صبح کو اسے شہید ہونا ہوتا ہے۔ انسانیت کی راہ میں بہے ہوئے خون کی کرشمہ سازیاں دیکھیے شہدا کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں نئے روپ دھار لیتے ہیں۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

فیض صاحب کی اس زمانے کی ذہنی کیفیت کی پوری پوری ترجمانی اگر کوئی نظم کرتی ہے تو وہ "دریچہ" ہے۔

منٹگمری سے دانتوں کے علاج کے سلسلے میں کوئی تین ہفتے کے لیے مارچ ۱۹۵۴ء میں ہمیں لاہور آنا پڑا۔ لاہور سے فیض صاحب کو والہانہ محبت ہے۔ وہ لاہور آنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے دل پر بار گزرے گا۔ یہاں آ کر لاہور کا پانی پیا، اس کی فضا میں سانس لیا، لاہور کی آوازیں سنیں اور لاہور کے بعض گاموں ماجھوں سے

جو ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں جیل میں آئے ہوئے تھے، ملاقات ہوئی اور اس دلدوز نظم "اے روشنیوں کے شہر" کا ظہور ہوا، جس پر کوئی شہر جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔

فیض صاحب کے دل میں لاہور اور لاہور والوں کی محبت کا جوش ایک دفعہ پہلے بھی اُمڈ پڑا تھا جب ۱۹۵۳ء میں لاہور کے گلی کوچے اس کے فرزندوں کے خون سے رنگین ہو گئے تھے۔ "لاہور کے نام" ابھی تک ادھوری ہے۔

منٹگمری میں ان کی شاعری کے بارے میں میری اور ان کی کافی بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی۔ میں کوئی نہ کوئی بات کہتا رہتا تھا اور ان کو جواب دیئے بغیر چارہ نہ تھا۔ شاعر اور ماعر والا معاملہ تھا۔ راہِ مفر ایک ہی تھی کہ سرکار کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے مجھ سے نجات پاتے۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا۔ آج کل بھی مذاقاً کہا کرتے ہیں کہ "زنداں نامہ" کے زنداں نامہ ہونے میں تمہاری "دہابیت" کو بھی دخل ہے۔

فیض کی جیل کی شاعری میں وطن کی محبت کے چشمے ہر طرف پھوٹ رہے ہیں۔ وہ جا بجا اپنے دیس اور اس کے باسیوں کی خستہ حالی، قوم کی عزت و ناموس کی ارزانی، لوگوں کی ناداری، جہالت، بھوک اور غم کو دیکھ دیکھ کر بے طرح تڑپ رہے ہیں۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

بعض دفعہ کچھ اور نہیں بنتا تو خیالی پلاؤ پکانے لگتے ہیں، اور جیل کی کال کوٹھڑی

میں بیٹھ کر بھی گرد آلود، پریشاں حال لیلائے وطن کو بنا سنورا دیکھنا چاہتے ہیں:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

وطن کی محبت اس طرح ان کے رگ وپے میں سرایت کر گئی ہے کہ اب اس کا دوسری محبتوں سے علحدہ کرکے دیکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

زنداں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ ہم سب کی حُبِّ وطن معمول سے زیادہ جوش پر تھی۔ صبح شام پاکستان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ بے بسی نے مزاجوں میں چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔ کبھی غضبناک ہو جاتے تھے کبھی گریہ وزاری کو جی چاہتا تھا۔ دست و پا تو ناکارہ کر دئے گئے تھے۔ لیکن دل و جاں پر آفت آئی ہوئی تھی۔

۱۹۵۱ء میں جب ہندوستان کے پاکستان کی طرف جارحانہ ارادوں کی خبریں شائع ہوئیں تو ہم میں سے ان افسروں نے جو ابھی تک معزول نہیں کیے گئے تھے، گورنمنٹ کو درخواست دی کہ پاکستان کی حفاظت میں ہم کو بھی جان لڑانے کی اجازت دی جائے، خاص طور پر جبکہ ہر ایک کو کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے

لڑنے کا تجربہ ہے۔ درخواست میں واضح کر دیا گیا تھا کہ ہمارا مقصد مقدمے سے جان چھڑانے کا نہیں۔ ہم گورنمنٹ سے سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتے کہ ہنگامی حالات کے دوران میں مقدمے کو ملتوی کر دیا جائے۔ یہ کوئی سٹنٹ (STUNT) بھی نہیں تھا، اس لیے کہ ہمیں معلوم تھا کہ ہندوستانی فوجوں کے شانہ بشانہ ہندو سبھائی اور اکالی درندے بھی ہوں گے اور مغربی پاکستان سے کوئی راہِ مفر نہیں تھی۔ ہماری درخواست مسترد کر دی گئی۔ بہرحال زمانہ کھرے کھوٹے کی تمیز زود یا بدیر کر ہی لے گا۔

نظیری کاش بنمائی کہ در ساغر چہ مے داری
کہ پیشِ زاہداں قدرِ گنہگاراں شود پیدا

ہندوستان اور پاکستان کا ذکر چل نکلا ہے۔ جیل میں فیض صاحب اکثر اپنے ہندوستانی دوستوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ ان میں کئی ایک لاہور کے رہنے والے تھے۔ کئی دوسرے سالہا سال تک پنجاب میں رہ چکے تھے۔ مولانا حسرت موہانی، رشید جہاں صاحبزادہ محمود الظفر، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، پنڈت ہری چند اختر، اپندر ناتھ اشک اور ان کی بیگم، ملک راج آنند، کرشن چندر، ڈاکٹر اشرف، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور دوسرے کئی اصحاب کا ذکر میں نے اتنی دفعہ سنا ہے کہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ ایک عرصہ سے جان پہچان ہے، حالانکہ ان میں سے میں کسی ایک کو بھی ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ سجاد ظہیر اور فیض اکٹھے ہو جاتے تھے تو پھر باتیں ہی اکثر ان لوگوں کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کا زمانہ فیض صاحب نے لاہور میں گزارا تھا۔ انہی دنوں

وہ مشرقی پنجاب بھی ہو آئے تھے ۔ طرفین کے بہادروں اور سورمیروں نے جس طور پر انسانیت کو ذلیل کیا تھا، اس کا آنکھوں دیکھا حال اکثر سنایا کرتے تھے ۔ بیان کرتے کرتے رقت طاری ہو جاتی اور رک جاتے ۔ میرے خیال میں وہ اتنے بڑے پیمانے پر اس تفصیل سے اس ہولناک خانہ جنگی کو دیکھنے پر مجبور رہے ہیں کہ شعروں میں اس کو لانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی ۔ ہو سکتا ہے کہ وقت ملنے پر وہ ناول یا ڈرامے کے ذریعے پنجاب کی اس ٹریجڈی کو بیان کریں ۔ پنجاب کی سرزمین یوں تو ہزاروں سالوں سے حملہ آوروں کی تاخت وتاراج کا شکار رہی ہے۔ شاید ہی یہاں کی کوئی نسل ایسی گزری ہوگی جس نے غیر ملکی گھوڑوں کے سُموں کی تاپ نہ سنی ہو ۔ لیکن ان حملہ آوروں میں سے اکثر بگولے کی طرح آتے تھے اور آندھی کی طرح گزر جاتے تھے ۔ تلوار کے سائے تلے جینے کی ذلت کچھ کم نہیں ہوتی، لیکن ۱۹۴۷ء میں جس طرح پنجابیوں نے پنجابیوں کو ذلیل و خوار کیا، تمام حملہ آوروں نے مل کر بھی نہیں کیا ہوگا ۔ امرتا پریتم کے الفاظ میں :

اَج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول
تے اَج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول
اِک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وَین
اَج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
اُٹھ دردمنداں دیا دردیا، اُٹھ تک اپنا پنجاب
اَج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب
کسے نے پنجاں پانیاں وِچ دِتّی زہر رلا
تے اوہناں پانیاں دھرت نوں دِتّا زہر رلا

دھرتی تے لہو وسیا قبراں پتیاں چون
پریت دیاں شہزادیاں اَج وچ مزاراں ون
اَج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور
اَج کتھوں لیائیے لبھ کے وارث شاہ اک ہور

فیض صاحب پاکستان میں بعض اصحاب کے اس نظریے پر بہت رنجیدہ خاطر ہُوا کرتے تھے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق ہندوستان سے بھی ہے۔ پاکستان کے لیے زہرِ ہلاہل ہے۔ ریڈیو پر سوائے اقبال کے کلام کی قوالیوں اور فلمی گانوں کے کچھ سننے میں نہیں آتا۔ چنانچہ ہم جیل والوں سے بچ بچا کر، ہندوستانی ریڈیو سٹیشنوں سے اپنے دیس کے راگ سنا کرتے تھے۔ کسی جاہل نے بزعمِ خود قومی جوش میں آکر امیر خسرو، تان سین، واجد علی شاہ، عبدالکریم خاں، فیاض خاں اور دوسرے بیسیوں اساتذہ اور زعما سے پاکستان کا رشتہ توڑنے کو عین حب الوطنی سمجھ لیا تھا۔

ملکوں کی سیاسی و اقتصادی حدیں وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہتی ہیں لیکن ایک خطۂ زمین کے کلچر، زبان، ادب، آرٹ، موسیقی، فنِ تعمیر اور دوسری ثقافتی قدروں کا قوام سیکڑوں، ہزاروں سالوں کی ریاضت کے بعد تیار ہوتا ہے اور اس کی بنیادی ترکیب میں تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔ پاکستان اور ہندوستان میں سیاسی دھینگا مشتی کیسی بھی صورت اختیار کر جائے دِلّی، لکھنؤ، حیدرآباد اور لاہور کی گنگا جمنی تہذیبیں اپنی جگہ قائم رہیں گی اور میر اور غالب میں سب کی سانجھ رہے گی۔ ہندوستانی اور پاکستانی تہذیبوں کے درختوں کی جڑیں موہنجو دھارو، گیا، ہرش پور، گندھارا،

ٹیکسلا، متھرا، بنارس، اجنٹا، اجمیر، قطب مینار، تاج محل، جامع مسجد، شالامار ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ شاخوں میں کہیں سمرقند و بخارا اور کہیں عرب و عجم سے آئے ہوئے پیوند اپنی بہار دکھا رہے ہیں اور کہیں پر اچین ڈالیں جوں کی توں قائم ہیں۔ ایک دوسرے کی ضد میں جڑوں کو نقصان پہنچانا یا شاخوں کی نوچ کھسوٹ کرنا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔

فیض صاحب اُن انسانیت نواز روایات سے تعلق رکھتے ہیں جو ہزاروں سال تک دونوں ملکوں کی سرزمین کا خاصہ رہی ہیں۔ وہ اسی سلسلے کی کڑی ہیں، جسے امیر خسرو، بھگت کبیر، خواجہ معین الدین چشتی، بابا نانک، بابا فرید، ابوالفضل، فیضی، بُلھے شاہ، وارث شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمان بابا اور دوسرے بہت سے بزرگوں نے فیض بخشا ہے۔

حیدرآباد میں ان کا درس و تدریس کا سلسلہ عجب متنوع قسم کا تھا۔ کوئی قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس لے رہا ہے۔ تو کوئی صوفیائے کرام کی تصانیف فتوح الغیب، کشف المحجوب، احیاء العلوم وغیرہ کے رموز و نکات سمجھ رہا ہے۔ کوئی انگریزی اور یورپین ادب کی الجھنیں پیش کر رہا ہے تو کسی نے مارکسی جدلیاتی فلسفے پر بحث شروع کر رکھی ہے۔ اُردو فارسی ادب تو تکیۂ کلام تھا۔ حیدرآباد میں ہم نے ان کو شاگرد کے رول میں بھی دیکھا ہے۔ پوشنی کے ساتھ مل کر سید سجاد ظہیر سے فرانسیسی زبان سیکھا کرتے تھے۔ نہایت غبی اور کام چور تھے۔ سید صاحب کی اُستادانہ گھرکیاں اور فیض صاحب کی بہانہ سازیاں بہت لطف پیدا کرتی تھیں۔

محنت کشوں سے انھیں خاص الفت ہے۔ حیدرآباد میں ایک بار ہمارے

احاطے میں بجلی کے کھمبے کا فیوز (FUSE) جل گیا۔ ایک مستری بغیر سیڑھی کے وہاں پہنچ گیا۔ ہم تلملانے لگے کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کے لیے آگیا ہے۔ اس نے کھمبے کو ذرا ٹھونکا بجایا اور یہ جا وہ جا۔ بغیر سیڑھی کے کھمبے کے سرے تک پہنچ کر آنکھ جھپکنے میں نیا فیوز لگا آیا۔ فیض صاحب دیر تک اس کے قصیدے پڑھتے رہے۔ منٹگمری میں شاہ جی، ایک پوسٹ مین، ہمارے پارسل وغیرہ لایا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر فیض صاحب کی آنکھوں میں جس قسم کی روشنی آجایا کرتی تھی وہ میں نے کم ہی دیکھی ہے۔ دونوں ٹریڈ یونین کے ممبر رہ چکے تھے۔ کہا کرتے ہیں ہندوستان پاکستان کے مسائل کا حل ایک ہی ہے کہ دونوں ملکوں میں محنت کش اپنے حقوق حاصل کرکے اپنے اپنے چمنستانوں کے والی بن جائیں۔ اس کے بعد ان ملکوں کے درمیان نفرت کا زہر اور اس کو پیدا کرنے والے حل طلب مسائل، جن کی آڑ میں سامراجی آج کل اپنے آہنی پنجے وطن عزیز کی رگوں میں دوبارہ پیوست کر رہے ہیں؛ یوں غائب ہو جائیں گے جیسے دیووں پریوں کے قصوں میں ہیرو کے اسم پڑھنے پر دیو بھوت اور دوسری بلائیں آناً فاناً رفع دفع ہو جاتی ہیں۔

فیض کی شاعری میں ایک صاحب دل کا جوش اور ولولہ ہے۔ اس میں قوم کی قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔ لیکن شاید کیا بات کہ اس کے قوام میں پاکستان کے محنت کشوں کا مبارک پسینہ اور خون کی حرارت ابھی تک پوری مقدار میں شامل نہیں ہیں۔ سمن وگلاب کو جس چاہت سے یاد کیا ہے۔ اسی چاہت اور تفصیل سے اس بدحالی بدنصیب کا ذکر نہیں ہے، جس نے سمن وگلاب کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر شاداب کیا ہے اور جس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی ان سمن و گلاب کی نزاکتوں، رنگ و روپ اور عطر بیزیوں

سے مستفید ہو سکے ۔ ان کا دل تو ادھر کھنچا جا رہا ہے ۔لیکن

لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی

ان کی شاعری کو ڈرائنگ روموں، سکولوں، کالجوں سے نکل کر سٹرکوں' بازاروں'

کھیتوں اور کارخانوں میں ابھی پھیلنا ہے ۔

وہ کہا کرتے ہیں کہ یہ چیز صرف پنجابی میں ہو سکتی ہے ۔لیکن میں سمجھتا ہوں' یہ اُن کی معمول کے مطابق کسرِ نفسی ہے اور جبلّی ہچکچاہٹ ۔ "دستِ صبا" کے ابتدائیہ میں انھوں نے فرمایا ہے ۔"یا یوں کہیے کہ شاعری کا کام صرف مشاہدہ ہی نہیں' مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے ۔ گردوپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے ۔ اس کو دوسروں کو دکھانا اس کی فنّی دسترس پر' اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا' اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر — اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدّ و جُہد چاہتے ہیں ۔" آگے فرمایا ہے کہ "حیاتِ انسانی کی اجتماعی جد وجہد کا ادراک اور جد وجہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے ۔" زنداں نامہ' اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ فیض کے مشاہدہ اور مجاہدہ کے تناسب میں مجاہدہ کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے اور یہی اس وقت ان کے فن کا تقاضا بھی معلوم ہوتا ہے ۔

اب ان کی نظریں لاہور کے مناظر سے اُٹھ کر پاکستان کے وسیع میدانوں پر پڑنے لگی ہیں ۔جہاں بے شمار انسان نما مٹی کے تودے صدیوں سے ایک ہی طرح کی دھیمی دھیمی حرکت کر رہے ہیں ۔ اب ان تودوں کی کمریں کچھ سیدھی ہو رہی ہیں ان کو اس بوجھ کا احساس ہو رہا ہے جو انھوں نے قرنوں سے اٹھا رکھا ہے ۔کیونکہ ان پر آہستہ آہستہ یہ بھید کھل رہا ہے کہ بعض دوسرے دیسوں میں ان کے بھائی بندوں

نے یہ بوجھ اُتار دیا ہے اور وہ لوگ اب انسانی عظمت میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک طرح کا نور ہے، کیونکہ وہ دور افق پر زندگی اور توانائی کی اُٹھتی گرتی گھٹتی بڑھتی روشنی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ کسی برہا کی ماری کی طرح جو اچانک اپنے پریتم کو نزدیک آتا دیکھے، ابھی تک لجا رہے ہیں، شرما رہے ہیں اور اپنی کم مائگی اور پریشان حالی کو چھپانا چاہتے ہیں۔ فیض صاحب کی نظریں کارخانوں میں بھی گھس رہی ہیں: جہاں کسانوں کے ساتھ مزدور انسان کی تخلیقی قوت اور اس کی عظمت کا درس حاصل کر رہے ہیں۔ فیض یہ سب کچھ خود ہی نہیں دیکھ رہے اپنے لاہوری بھائی بندوں، دماغی مزدوری کرنے والے مصنفوں، کلرکوں، چھوٹے دکانداروں، وکیلوں، ٹیچروں، طالب علموں، گاموں اور ماجھوں کو بھی دکھلا رہے ہیں اور پکار رہے ہیں کہ کارگہِ ہستی میں جو رن پڑ رہا ہے، اس میں حق و باطل کے لشکروں کو پہچانو۔ "ناداری، دفتر، بھوک اور غم" نے جو مکھ پتھراؤ کر کے تمہارے ساغرِ دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور تمہاری عزت اور ناموس خاک میں ملا دی ہے۔ صہبائے غمِ جاناں کی پری کی بے حرمتی کر دی ہے۔ لیکن

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اِک بخیہ ادھیڑا ایک سِیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

۴۱

اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

اب لُوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکائے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو
نیلام چڑھائے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی
ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں

اِن دونوں میں رن پڑتا ہے
نِت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے پھرتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے پھرتے ہیں

سب ساغر شیشے لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

"زنداں نامہ" میں فیض صاحب نے حق و باطل کی اس ہولناک جنگ میں بہادروں کی بہادری کے واقعات کا تذکرہ شروع کر دیا ہے۔ اس کی ابتدا وہ "دستِ صبا" میں "ایرانی طلبہ کے نام" لکھ کر چکے ہیں، لیکن ابھی تک ان کی یہ عادت پوری طرح نہیں گئی کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کے دھوئیں کے پہلے

مرغولہ (PUFF) کو ہی لے بیٹھتے ہیں ۔ اور جب یہ دھواں ہوا کے جھونکوں سے چشم زدن میں تتر بتر ہو جاتا ہے تو رنجیدہ خاطر ہو جاتے ہیں یا طوفان کی پہلی موج میں ہی محوِ تماشا ہو جاتے ہیں اور جب اسے ساحل کی ریتی میں جذب ہوتا دیکھتے ہیں تو فرطِ درد سے بے حال ہو جاتے ہیں یا بڑھتے ہوئے لشکر کے سب سے اگلے سکاؤٹ جب کھیت ہو جاتے ہیں۔ تو ان کو تڑپتا دیکھ کر تمام نظامِ کائنات کو آگ لگا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے درد کی فراوانی ہر نیک دل کا خاصہ ہوتی ہے ۔ لیکن اگر آتش فشاں زمیں دوز گرج کو سنا جائے اور اس کے چند لمحوں میں اُبلنے والے کروڑوں من لاوا کا تصور کیا جائے یا پہلی لہر کے پیچھے بپھرے ہوئے بے کنار سمندر کا خیال کیا جائے تو صوتیں کے پہلے مرغولہ کے بکھرنے طوفان کی پہلی لہر کے جذب ہو جانے اور اسکاؤٹوں کے مرنے میں درد و غم کی جگہ مجاہدانہ تڑپ آجاتی ہے ۔ زندگی کے سائے گہرے ہونے کی بجائے اس کی رنگینیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ ان تینوں کی موت پر رونے دھونے کی بجائے ان کی یادگار منانے کو جی چاہتا ہے ۔ وہ عشق و محبت کے پہلے کشتے ہی نہیں فتح کے بانی بھی ہیں اور ان کی موت زندگی کا رس ہے ۔ فیض صاحب کا کینوس ذرا اور وسیع ہو جائے تو بلاشبہ ہمارے ادب کے گورکی بن جائیں گے ۔ ان سے زیادہ اس رتبہ کا اور کون مستحق ہے ؟ بدقسمتی سے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ان میں رجز خواں ایک جان کے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے ؟

منٹگمری میں میری ایک ڈیوٹی فیض صاحب کے لیے سامعین فراہم کرنا تھی اس کا ایک ذریعہ یہ تھا کہ میں ان کا تازہ کلام سید سجاد ظہیر صاحب کو مچھ جیل میں اور

عطا اور روشنی کو حیدر آباد بھیج دیا کرتا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے ایک خط کا اقتباس اس مضمون کے اختتام کے لیے بہت مناسب رہے گا۔

سنٹرل جیل

مچھ بلوچستان۔ ۲۱ر فروری ۵۴ء

..... آئندہ میں زیادہ باقاعدگی سے تمھارے خطوں کا جواب دوں گا۔ اس ارادے میں صرف اخلاقی فرض ہی کا تقاضا نہیں بلکہ میری خود غرضی بھی شامل ہے۔ تمھارے خطوں سے دوستی اور التفات کی لطیف مہک آتی ہے۔ جس سے رنجور دل کو بے انتہا ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اس طرح ہم تنہائی میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ تھوڑی بہت فلسفیانہ اور ادبی موشگافیاں کر لیتے ہیں اور آہنی دیواروں میں کسی قدر رخنہ ڈال کر جیسے نکلتے ہوئے سورج کی کرنوں نے ذرا دیر کے لیے دل و دماغ کو منور کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ تم فیض کے کلام کے تحفے بھی بھیجتے ہو اور اب کی تو تم نے اس کے انبار لگا دیئے ہیں، ان کے لیے فیض اور تمھارا بہت بہت شکریہ۔ یہ تو ایسا عطیہ ہے جس کا عوض مجھ سے کبھی ادا ہی نہیں ہو سکتا۔

فیض کی نظم "ملاقات" مجھے پسند آئی ہے۔ اس میں علائم کی مرصع نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرعے سے شروع ہو کر (یہ رات اس درد کا شجر ہے) نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے نازک پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں۔ جن میں ہر ایک ایسا ہے جو اپنی جداگانہ خوشبو اور رنگ بھی رکھتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ اور متوازن بھی ہے، پھر نظم کا بنیادی خیال پوری تخیل کے ساتھ بڑی کامیابی سے ملایا گیا ہے، جیسے ایک حسین اور

نازک جسم میں دردمند، حساس اور لطیف روح ہو۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ محن، غمناکی، شدتِ درد اور ان سب کے باوجود، بلکہ ان کے وسیلے سے نمودار ہونے والی "نئی سحر" کے تصور کو گرفت میں لانے کے بعد شاعر نے اُسے نظم کا جامہ پہنایا ہے، بلکہ یہاں پر یہ بلند ہمت آور خیال اور تصور جیسے شاعرانہ تخیل کا ثمر ہے اور پوری نظم کے گلدستے سے دل آویز اور روح افزا رنگینیوں اور نکہتوں کے ساتھ جھک پڑا ہے۔ تیسرے بند کے شروع کے چار مصرعے، جہاں سے گریز کیا گیا ہے، اپنی فصاحت، موسیقیت، روانی اور زورِ کلام کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انھیں ایک بار پڑھ لو تو دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور پھر بھولتے نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اتوار کی صبح کو کسی کلیسا کی گھنٹیاں لنک لنک کر بج رہی ہوں اور ان کی مسلسل آواز صرف سامعہ میں نہیں بلکہ سارے جسم کے پوروں میں سرایت کر رہی ہو۔ فیض کی شاعری کا "رنگ" لوگ جس بات کو کہتے ہیں، اس میں لہجے کی دردناکی اور فضا کی نرمی ایک چیز ہے۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ ان مصرعوں میں وہ رنگ نہیں ہے۔ اچھے اور بڑے شاعر اپنا رنگ ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں گو وہ اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔

"..... تم نے اپنے گزشتہ خط میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اب انھیں ہمت کر کے ایک جست لگانی چاہیے، تاکہ ان کی شاعری میں خوشبوؤں اور گل بیزیوں کے علاوہ خلقِ خدا کے اس مبارک پسینے اور خون کی حرارت کی آمیزش بھی ہو، جس سے فی الحقیقت زندگی بنتی بدلتی اور سنورتی ہے۔ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں۔ البتہ میں انھیں ایسا کرنے کے لیے دھکا نہیں دینا چاہتا ..... ان امید افزا

علامات کے سبب سے جو حالیہ نظموں اور غزلوں میں خود ہی نظر آ رہی ہیں، جو کہ صحیح جمہوری سمت کا پتہ دیتی ہیں۔

میرے خیال میں وہ خود اس نکتہ کو سمجھتے ہیں۔ پنجاب کی سرزمین صدیوں پہلے بابا فرید، وارث شاہ، بلھے شاہ کی ذاتوں میں، دوسرے حالات اور دوسرے ماحول میں، ایسی جمہوری شاعری پیدا کر چکی ہے، ہمارے یہاں کبیر، تلسی، سور ہو چکے ہیں۔ ایسے نغمے پھر کیوں نہیں چھیڑے جا سکتے۔

ان نئی غزلوں پر ان کو مبارک باد دینا، گو یہ صحیح ہے کہ داد مرزا جعفر علی خاں سے ہی لینا چاہیے میں تو اب برائے نام لکھنؤ کا رہ گیا ہوں۔ چھ سال پنجاب میں اور پنجابیوں کے ساتھ رہ کر اللہ ہی جانتا ہے کہ زبان کتنی "بگڑ" گئی ہے۔ شاید چونکہ موسم بہار کا ہے۔ اس لیے ہمیں "گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے" والی غزل سب سے اچھی لگی۔ اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جس غزل کو تم نے واسوخت کا عنوان دیا ہے۔ وہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہے۔ ایک ایک شعر نشتر ہے۔ کس کس کی تعریف کریں۔ خاص طور پر یہ شعر

گر فکرِ زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے

اس کی داد تو فیض مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے۔ جعفر علی خاں اثر تو الگ رہے . . . . "

اے ساکنانِ کُنجِ قفس! صبح کو صبا
سُنتی ہی جائے گی سُوئے گلزار، کچھ کہو!

(سودا)

○
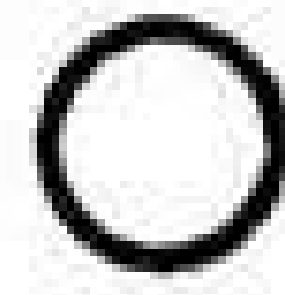
شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

تجھ کو دیکھا تو سیرِ چشم ہُوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

تھے شبِ ہجر، کام اور بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

زنداں نامہ
۵۰

○
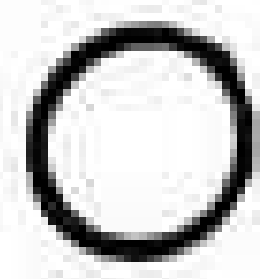
سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سُرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اِک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

بادِ خزاں کا شکر کرو، فیضؔ، جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

اے حبیبِ عنبر دست!

[ایک اجنبی خاتون کے نام
خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر]

کسی کے دستِ عنایت نے کنجِ زنداں میں،
کیا ہے آج عجب دل نواز بندوبست
مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گل بدن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست

لیے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست

یہ شعرِ حافظِ شیراز' اے صبا! کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دست
"خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

سنٹرل جیل۔ حیدر آباد
۲۸-۲۹ اپریل ۵۳ء

○
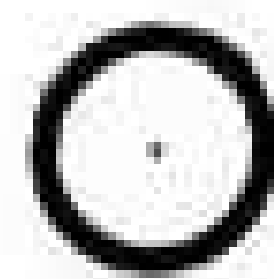
ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب جُرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہُوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

زنداں نامہ
۵۴

کرے کوئی تیغ کا نظارا، اب اُن کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

حیدرآباد جیل
۱۷-۲۲ مئی ۱۹۵۴ء

○
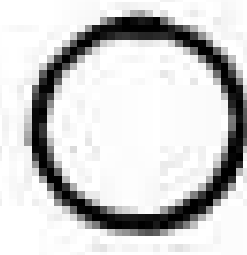
شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اُٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہم سفر فیض نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

جناح ہسپتال کراچی جولائی ۵۳ء

○
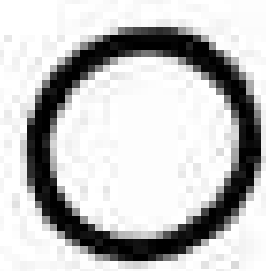
رہِ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حُسنِ یار کرتے رہے

خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اِسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم اُن سے رشتۂ دل اُستوار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم اُن میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

زنداں نامہ

۵۷

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخنِ راز دار کرتے رہے

ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

اُنھیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

جناح ہسپتال، کراچی
۲۱ راگست، ۵۳ء

مُلاقات

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گِھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نُور، رو گئے ہیں

یہ رات اُس درد کا شجر ہے

جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

مگر اسی رات کے شجر سے

یہ چند لمحوں کے زرد پتّے

گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں

اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں

اسی کی شبنم سے خامشی کے

یہ چند قطرے، تری جبیں پر

برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن

اِسی سیاہی میں رُونما ہے

وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے

زنداں نامہ

۶۰

اسی کے سائے میں نُور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سُلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۳)

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

منٹگمری جیل
۱۲- اکتوبر ۳- نومبر ۵۳ء

۶۲

○
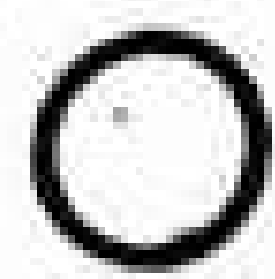
نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

○
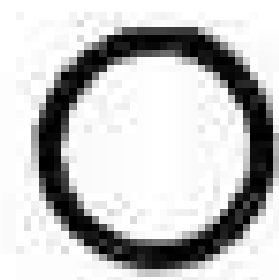
بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے

اب جنوں حد سے بڑھ چلا ہے
اب طبیعت بہل چلی ہے

اشک خونناب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل چلی ہے

یا یونہی بجھ رہی ہیں شمعیں
یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے

لاکھ پیغام ہو گئے ہیں
جب صبا ایک پل چلی ہے

جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چلی ہے

منٹگمری جیل
۲۱ نومبر ۱۹۵۳ء

واسوخت

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں، جو جفا بھی آپ نے کی، قاعدے سے کی!
ہاں، ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

زنداں نامہ

۶۶

کیوں دادِ غم، ہمیں نے طلب کی، بُرا کیا
ہم سے جہاں میں کُشتۂ غم اور کیا نہ تھے

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دُکھ تھے، بہت لادوا نہ تھے

لب پر ہے تلخیٔ مئے ایّام، ورنہ فیضؔ
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

منٹگمری جیل
۲۴ نومبر ۵۳ء

○
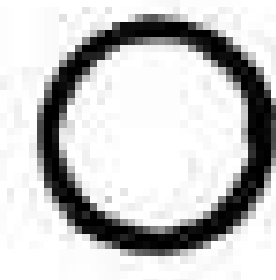
شاخ پر خونِ گُل رواں ہے وہی
شوخیِ رنگِ گلستاں ہے وہی

سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یارِ مہرباں ہے وہی

زنداں نامہ

۶۸

برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

چاند تارے اِدھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

منٹگمری جیل

○
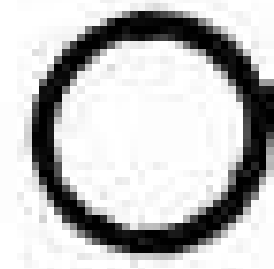
کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں

صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں

دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں -

عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا

گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

۷۰

○
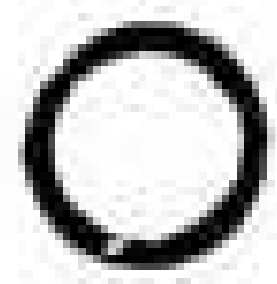
ہم پر تمھاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فضول و الفتِ ناکام ہی تو ہے

دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

۱۷

دل نا اُمید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات فیضؔ غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

منٹگمری جیل
۹ر مارچ ۵۴ء

۷۲

اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ، سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اُٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اِس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

۷۳

آج مرا دل فکر میں ہے

اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو

خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو

آج کی شب جب دیئے جلائیں، اونچی رکھیں لو

لاہور جیل - ۲۸ مارچ

منٹگمری جیل - ۱۵ اپریل

۵۴ء

○

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کُنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

۷۵

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام، فیض، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

منٹگمری جیل
۲۹ جنوری ۵۴ء

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

[ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے
خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی]

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سُولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی،
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عُشّاق کے قافلے

زنداں نامہ

۷۸

جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

منٹگمری جیل
۱۵ مئی ۵۴ء

○
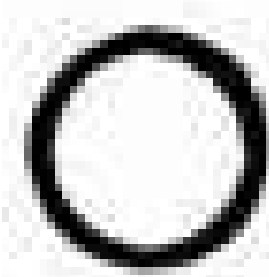
فکرِ سود و زیاں تو چھوٹے گی
منّتِ این و آں تو چھوٹے گی
خیر، دوزخ میں مے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

۸۰

○
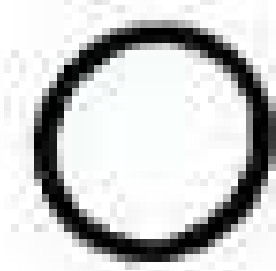
کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصّے کی، اب جام میں کمتر جاتی ہے

یوں عرض و طلب سے کب اے دل، پتّھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خُو ڈالو، کب خوئے ستمگر جاتی ہے

بیداد گروں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اب کوچۂ دلبر کا رہرو، رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطّر آتی ہے، اشکوں سے منوّر جاتی ہے

منٹگمری جیل
۱۷ر جون ۵۴ء

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لیے۔

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

منٹگمری جیل
دسمبر ۵۴ء

۲۰۰۵

درد آئے گا دبے پاؤں ......

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آلے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا

حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا
مشتعل ہو کے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہوگا
جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل
دشمنِ جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل

لاؤ، سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتشِ جرّار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہُوا گلزار کہاں ہے لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی توانائی بھی

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

منٹگمری جیل
یکم دسمبر ۵۴ء

○
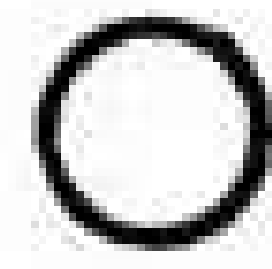
صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگِ رخسار کی پھُوہار گری
رات چھائی تو رُوئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

AFRICA COME BACK*

(ایک رجز)

آجاؤ، میں نے سُن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال

"آجاؤ ایفریقا"

آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اُٹھا لیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال

"آجاؤ ایفریقا"

* افریقی حریت پسندوں کا نعرہ

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال

"آجاؤ ایفریقا"

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال

آجاؤ ایفریقا"

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا"
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال

"آجاؤ ایفریقا"

آؤ ببر کی چال

"آجاؤ ایفریقا"

منٹگمری جیل
۱۴ر جنوری ۵۵ء

○
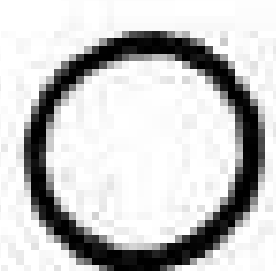
گرمیِ شوقِ نظارا کا اثر تو دیکھو
گُل کھِلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہگزر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے تمھیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے
اِک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

وہ جو اب چاکِ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی اُن کا جگر تو دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا اُفق
فیضؔ، تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

منٹگمری جیل
۴ مارچ ۵۴ء

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم

سب کاٹ دو

بسمل پودوں کو

بے آب سسکتے مت چھوڑو

سب نوچ لو

بیکل پھولوں کو

شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو

یہ فصل امیدوں کی ہمدم

اس بار بھی غارت جائے گی

سب محنت، صبحوں شاموں کی

اب کے بھی اکارت جائے گی

کھیتی کے کونوں، کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی فکر کرو

پھر اگلی رُت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اُجڑنا ہے
اِک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

منٹگمری جیل
۳۰ مارچ ۵۵ء

بنیاد کچھ تو ہو

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو

کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو

بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو

بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا

اِتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا

مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا

۹۵

رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالہ، ہاؤہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

منٹگمری جیل
۱۲؍ اپریل ۵۵ء

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے!

یاد کی راہگزر جس پہ اِسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمھیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشتِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو
سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راہگزر
پھر اسی طرح جہاں ہوگا مقابل پیہم
سایۂ زلف کا اور جنبشِ بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے
یاں کوئی موڑ کوئی دشت کوئی گھات نہیں
جس کے پردے میں مرا ماہِ رواں ڈوب سکے
تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

اگست ۵۵ء

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

لطف کر، اے نگہِ یار، کہ غم والوں نے
حسرتِ دل کی اُٹھائی نہیں تمہید اب کے

چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

دل دُکھا ہے نہ وہ پہلا سا نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھّو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

کراچی ۱۴ اگست، ۱۹۵۵ء

○
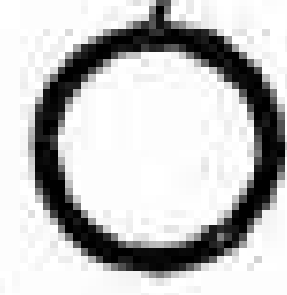
یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچۂ یار سے بے نیلِ مرام آتا ہے

ہر کوئی شہر میں پھرتا ہے سلامت و امن
رند میخانے سے شائستہ خرام آتا ہے

ہوسِ مطرب و ساقی ہیں پریشاں اکثر
ابر آتا ہے کبھی ماہِ تمام آتا ہے

شوق والوں کی حزیں محفلِ شب میں اب بھی
آمدِ صبح کی صورت ترا نام آتا ہے
اب بھی اعلانِ سحر کرتا ہُوا مست کوئی
داغِ دل کر کے فروزاں سرِ شام آتا ہے

لاہور؟ ارچ ۵۸ء

ناتمام

○
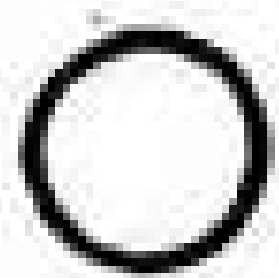
تمام شب دلِ وحشی تلاش کرتا ہے
ہر اک صدا میں ترے حرفِ لطف کا آہنگ
ہر ایک صبح ملاتی ہے بار بار نظر
ترے دہن سے ہر اک لالہ و گلاب کا رنگ

○
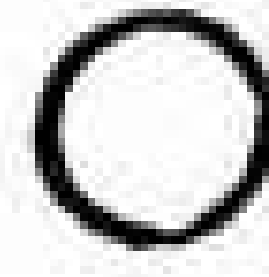
تمہارے حسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر

تمہاری یاد سے دل ہمکلام رہتا ہے

رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے

تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

حیدرآباد جیل
۱۹۵۱ء

○
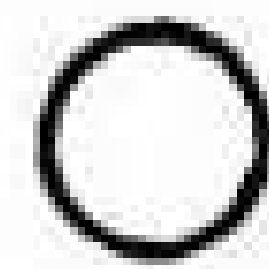
کھلے جو ایک دریچے میں آج حسن کے پھول

تو صبح جھوم کے گلزار ہو گئی یکسر

جہاں کہیں بھی گرا نور اُن نگاہوں سے

ہر ایک چیز طرحدار ہو گئی یکسر

جناح ہسپتال
کراچی

○
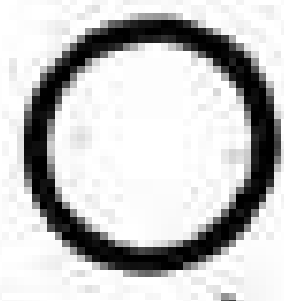
صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون

شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رخسار، ہے کون

رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پوچھو
آج بکھرائے ہوئے زلفِ طرحدار ہے کون

پھر درِ دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانیے پھر دلِ وحشی کا طلبگار ہے کون
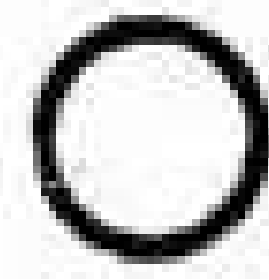
جولائی ۵۳ء جناح ہسپتال کراچی

○

تری امید، ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہمکلام کب سے ہے

لاہور - مارچ ۵۳ء

○
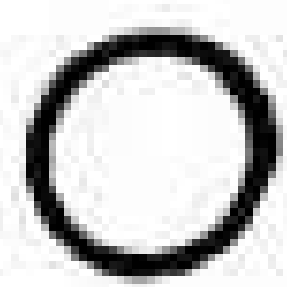
رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں اِن مہینوں میں

دستِ تہِ سنگ

اِنتساب

دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حُسنِ آفاق، جمالِ لب و رخسار کے نام

ترتیب

دستِ تہِ سنگ

نسخہائے وفا ۳۰۰ دستِ تہِ سنگ ۶

سرِ آغاز

شاید کبھی افشا ہو، نگاہوں پہ تمھاری
ہر سادہ ورق، جس سخنِ کشتہ سے خوں ہے
شاید کبھی اُس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمدِ صرصر کی تمنّا میں نگوں ہے
شاید کبھی اُس دل کی کوئی رگ تمھیں چبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبوں ہے

تقریر

فیض صاحب کی تقریر جو انھوں نے ماسکو میں بین الاقوامی
لینن امن انعام کی پُرشکوہ تقریب کے موقع پر اُردو زبان میں کی :

محترم اراکینِ مجلسِ صدارت، خواتین اور حضرات!

الفاظ کی تخلیق و ترتیب شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے۔ لیکن زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ قدرتِ کلام جواب دے جاتی ہے۔ آج عجزِ بیان کا ایسا ہی مرحلہ مجھے درپیش ہے۔ ایسے کوئی الفاظ میرے ذہن میں نہیں آ رہے، جن میں اپنی عزت افزائی کے لیے لینن پرائز کمیٹی، سوویٹ یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور سب خواتین اور حضرات کا شکریہ خاطر خواہ طور سے ادا کر سکوں۔ لینن امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے۔ لینن جو دورِ حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علم بردار ہے اور امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرطِ اول ہے۔ مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اِس عظیم اعزاز کے شایانِ شان ہو۔ لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے رفیقوں کو وابستگی رہی ہے یعنی امن اور آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اور اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

۱۰

یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوشمند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں، تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں۔ یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے بھی فرق ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں ابنِ آدم کی بقا اور فنا۔ بقا اور فنا ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دار و مدار ہے۔ انھیں پر انسانوں کی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار ہے یہ پہلا فرق ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پا سکتیں۔ اس لیے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود ہے، لیکن اب یہ صورت نہیں ہے۔ اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں۔ بشرطیکہ قدرت کے یہ بے بہا ذخائر پیداوار کے یہ بے انداز خرمن بعض

اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکینِ ہوس کے لیے نہیں، بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لیے کام میں لائے جائیں۔ اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ڈھانچے کی بنائیں ہوسِ استحصال اور اجارہ داری کے بجائے انصاف، برابری، آزادی اور اجتماعی خوش حالی میں اٹھائی جائیں۔ اب یہ ذہنی اور خیالی بات نہیں، عملی کام ہے۔ اِس عمل میں امن کی جد وجہد اور آزادی کی حدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ اِس لیے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مفاد، جن کے اجارے جبر اور حسد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنھیں ان اجاروں کے تحفظ کے لیے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنھیں بنکوں اور کمپنیوں کی نسبت انسانوں کی جان زیادہ عزیز ہے۔ جنھیں دوسروں پر حکم چلانے کے بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ سیاست و اخلاق، ادب اور فن۔ روزمرہ زندگی، غرض کئی محاذوں پر، کئی صورتوں میں تعمیر اور تخریب، انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں کے لیے ان میں سے ہر محاذ اور ہر صورت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کش مکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک میں بھی شدید اختلافات موجود ہیں۔ جنھیں حال ہی میں آزادی ملی۔ ایسے اختلافات ہمارے ملک پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان میں موجود ہیں۔ بعض عرب ہمسایہ ممالک میں اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو امنِ عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یکانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر اور اس حل میں امداد دینا بھی لازم ہے۔

اب سے کچھ دن پہلے جب سوویٹ فضاؤں کا تازہ کارنامہ ہر طرف دنیا میں گونج رہا تھا تو مجھے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا میں بیٹھ کر اپنی ہی دنیا کا نظارہ کرسکتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کمینگیاں، خود غرضیاں، یہ زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوششیں اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکہ چلانے کی خواہش کیسی بعید از عقل باتیں ہیں۔ اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہوگئے ہیں۔ ساری دنیا کے خزینے انسانی بس میں آسکتے ہیں، تو کیا انسانوں میں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو۔ یہ بم اور راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کردو۔ اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیرِ کائنات کو چلو۔ جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے، جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، جہاں لامحدود فضائیں ہیں اور اَن گنت دنیائیں۔ مجھے یقین ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ اپنی انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہوکر رہے گی۔ اور آخرکار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

فیض ——— از فیض

اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سب بور
لوگوں کا مرغوب شغل یہی ہے۔ اس انگریزی لفظ کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اب تو ہمارے
ہاں اس کے مشتقات بوریت وغیرہ بھی استعمال میں آنے لگے ہیں اس لیے اب اسے اردو روزمرہ
شامل سمجھنا چاہیے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں قیل و قال بری لگتی ہے۔ بلکہ میں
تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا، اور 'میں' کے بجائے ہمیشہ سے 'ہم'
لکھتا آیا ہوں۔ چنانچہ جب ادبی سراغرسان حضرات مجھ سے یہ پوچھنے بیٹھتے ہیں کہ تم شعر کیوں کہتے
ہو تو بات کو ٹالنے کے لیے جو دل میں آئے کہہ دیتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ بھئی میں جیسے بھی کہتا ہوں جس
لیے بھی کہتا ہوں تم شعر ہیں سے خود ڈھونڈ لو، میرا سر کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن ان بیا
سے ڈھیٹ قسم کے لوگ جب بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کی سب ذمہ داری ان حضرات
کے سر ہے مجھ پر نہیں ہے۔

شعر گوئی کا واحد عذرِ گناہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اس میں بچپن کی فضائے گرد و پیش میں شعر کا
چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ نقشِ فریادی کے پہلے
حصے کی بات ہے جس میں ۲۹-۱۹۲۸ء سے ۳۵-۱۹۳۴ء تک کی تحریریں شامل ہیں، جو ہماری
طالب العلمی کے دن تھے، یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی
واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری

محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دَور بھی ایک دور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دو الگ الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں ہے کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا، جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اوّلاً حسرت موہانی اور ان کے بعد جوشؔ، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی، افسانے میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔ نقشِ فریادی کی ابتدائی نظمیں، خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو، مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو، تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں، وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیرِ اثر مرتب ہوئیں اور اس فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا۔ لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبتِ یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی۔ اُجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگِ سوزِ محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اس کیفیت کا اختتام جو نقشِ فریادی کے پہلے حصے کی آخری نظموں کی کیفیت ہے ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے، جسے میں نے یاس کا نام دیا تھا۔ وہ یوں ہے :-

یاس

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم

زحمتِ گریہ و بکا بے سود
شکوۂ بختِ نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول
بے نیازِ دعا ہے ربِ کریم

بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ الفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے

۳۴ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور ۳۵ء میں میں نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کر لی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہمعصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقا صاحبزادہ محمود الظفر مرحوم

دستِ تہِ سنگ

۱۶

اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس میں بہرحال گرد وپیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیرسودمند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبّتوں اور کدورتوں مسرّتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالمِ موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے۔ چنانچہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتدا نقشِ فریادی کے دوسرے حصّے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ" اور اگر آپ خاتون ہیں تو "مرے محبوب نہ مانگ"

"مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ"

مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہُوئے
جا بجا بکتے ہُوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہُوئے خون میں نہلائے ہُوئے

جسم نکلے ہُوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہُوئی گلتے ہُوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد تیرہ چودہ برس "کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں" میں گزرے اور پھر فوج، صحافت، ٹریڈ یونین وغیرہ میں گزارنے کے بعد ہم چار برس کے لیے جیل خانے چلے گئے۔ نقشِ فریادی کے بعد کی دو کتابیں "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" اسی جیل خانے کی یادگار ہیں۔ بنیادی طور سے تو یہ تحریریں انھیں ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ مجھ سے پہلی سی محبت، سے شروع ہُوا تھا لیکن جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے، جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کُھل جاتا ہے۔ چنانچہ اوّل تو یہ ہے کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسّیات یعنی Sensations پھر تیز ہو جاتی ہیں اور صبح کی پو، شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ، ہوا کے گداز کے

۱۸

بارے میں وہی پہلا سا تحیّر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں، نزدیک کی چیزیں بھی بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک اور فردا و دی کا تفرقہ کچھ اس طور سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات، تیسری بات یہ ہے کہ فراغتِ ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروسِ سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔ جیل خانے کے بھی دو دَور تھے۔ ایک حیدرآباد جیل کا جو اس تجربے کے انکشاف کے تحیّر کا زمانہ تھا، ایک منٹگمری جیل کا جو اس تجربے سے اکتاہٹ اور تھکن کا زمانہ تھا۔ ان دو کیفیتوں کی نمائندہ یہ دو نظمیں ہیں، پہلی "دستِ صبا" میں سے دوسری "زنداں نامہ" میں سے

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم

۱۹

نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

"اے روشنیوں کے شہر"

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور اُفق تک گھٹتی، بڑھتی، اُٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اِس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لو

زنداں نامے کے بعد کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری کا زمانہ ہے جس میں اپنا اخباری پیشہ چھٹا۔ ایک بار پھر جیل خانے گئے۔ مارشل لا کا دور آیا، اور ذہنی اور گرد و پیش کی فضا میں پھر سے کچھ انسدادِ راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہُوا۔ اس سکوت اور انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے "شام" اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار:
کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی!

فیض

○
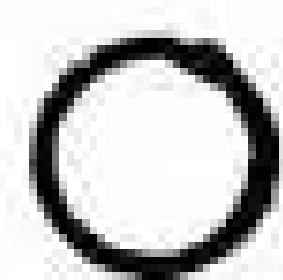
یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہُوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

دستِ تہِ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپئے آزار صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے
اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہُوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے

دستِ تہِ سنگ
۲۳

وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے
ہاں جام اُٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے
اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے
احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلا ہے
اُس حسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے
ہر صبحِ گلستاں ہے ترا رُوئے بہاریں
ہر پُھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے
ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہُوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے
ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنّا ترے قدموں کی صدا ہے

دستِ تہِ سنگ

۲۴

تعزیرِ سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے

وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے

زندانِ رہِ یار میں پابند ہُوئے ہم

زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے

"مجبُوری و دعوائے گرفتاریٔ اُلفت

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

○
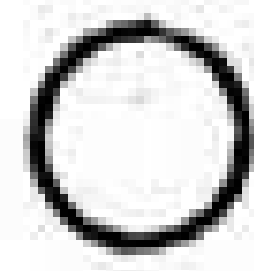
میخانوں کی رونق ہیں، کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداریٔ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

سفرنامہ

(۱)

پیکنگ

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن دشت و چمن کی حد ہے

میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کن فیکوں

(۲)

سنکیانگ

اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہسوار
صبحدم موت کی وادی کو روانہ ہوگا!
اب کوئی جنگ نہ ہوگی نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر نہ کسی آنگن میں
وہمِ منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم، خونخوار درندے کی طرح آئے گا

۲۸

اب کوئی جنگ نہ ہوگی مے و ساغر لاؤ
خوں لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا
ساقیا! رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت
مطربا! کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

○
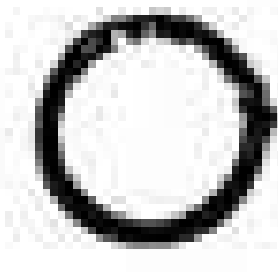
بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

چھلک رہی ہے ترے حُسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہُوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام

گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر ایک رُوئے حسیں ہو چلا ہے بیش حسیں

ملے کچھ ایسے، جُدا یوں ہُوئے کہ فیضؔ اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گُل ہے داغ نہیں

ہانگ چاؤ (چین)
جولائی ۱۹۵۶ء

جشن کا دن

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے

تنک مزاج ہے ساقی نہ رنگِ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیزِ رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہے انتظارِ ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورشِ غمِ دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دُھن میں سُناؤ کہ جشن کا دن ہے

مارچ ۱۹۵۷ء

○
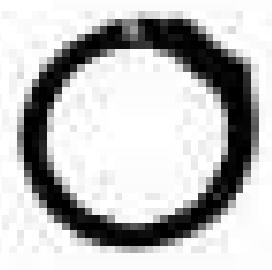
رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عُشّاق کی خبر لینا
پھُول کھِلتے ہیں اِن مہینوں میں

○
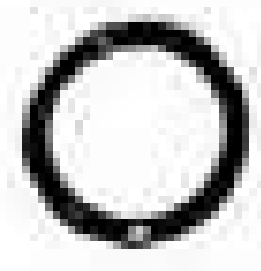
آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظِر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

اپریل ۱۹۵۶ء

شام

اِس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اجڑا ہوا، بے نور پرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام، ہر اک در کا دمِ آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے، ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے
اس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے

جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوست ہے یوں دامنِ شام
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہو گا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہو گا

آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چُپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھُوٹے
دے کوئی سنکھ دُہائی، کوئی پایَل بولے
کوئی بُت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

۳۵

○
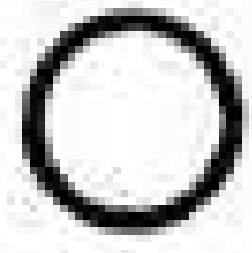
بجھے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بُجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ اے مہِ شبِ غم، نظر پہ کھُلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے، کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گُل سرِ شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہِ دام بُجھ گئے ہیں

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں!

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی!
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اُترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی، نہ کوئی علَم
منتشر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دشمنوں کا پتا دے سکا
تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی!
جس میں رکھا نہیں ہم نے اب تک قدم

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارا نہیں
جسم خستہ ہے، ہاتھوں میں یارا نہیں

اپنے بس کا نہیں بارِ سنگِ ستم
بارِ سنگِ ستم، بارِ کہسارِ غم
جس کو چھو کر سبھی اک طرف ہو گئے
بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

دوستو، کوئے جاناں کی نامہرباں
خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار
اب نہ آئے گی کیا؟ اب کِھلے گا نہ کیا
اس کفِ نازنیں پہ کوئی لالہ زار؟
اس حزیں خامشی میں نہ لوٹے گا کیا
شورِ آوازِ حق، نعرۂ گیر و دار

شوق کا امتحاں جو ہُوا سو ہُوا
جسم و جاں کا زیاں جو ہُوا سو ہُوا
سُود سے پیشتر ہے زیاں اور بھی
دوستو، ماتمِ جسم و جاں اور بھی
اور بھی تلخ تر امتحاں اور بھی

جنوری ۱۹۵۶ء

○
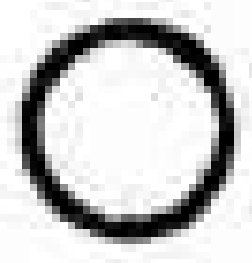
نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

○
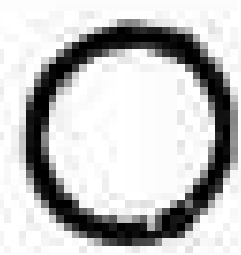
بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صِلا کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
مُنصِف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادیٔ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

لاہور جیل
۳۱ ر دسمبر ۱۹۵۸ء

شورشِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

درِ زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گنو سب داغ دل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شبگیر بسم اللہ

ستم کی داستاں، کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرفِ ناگفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہُوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

لاہور جیل
جنوری ۱۹۵۹ء

آج بازار میں پا بجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

لاہور جیل
۱۱ر فروری ۱۹۵۹ء

○
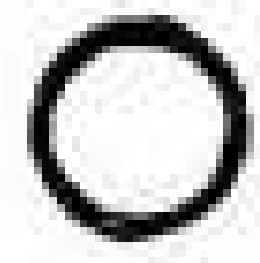
یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد رُوئے مریم

دل و جاں فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ چمن جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہُوا کہ مَر مٹیں ہم، نہ ہُوا کہ جی اُٹھیں ہم

لو سُنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

لاہور جیل
فروری ۱۹۵۹ء

قیدِ تنہائی

دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہُوا درد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آبادِ جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صبُوحی میں نے
گھول کر تلخیِ دیروز میں امروز کا زہر

دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دُور کسی صبح کی تمہید لیے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
بے خبر گزری، پریشانیٔ اُمّید لیے
گھول کر تلخیٔ دیروز میں امروز کا زہر
حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی میں نے
دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حُسنِ آفاق، جمالِ لب و رخسار کے نام

زندانِ قلعۂ لاہور
مارچ ۱۹۵۹ء

○
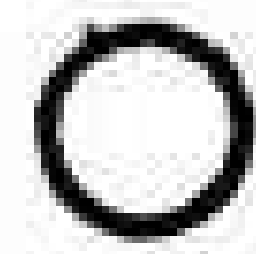
ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام اُلٹائے دیتے ہیں

قلعہ لاہور
مارچ ۱۹۵۹ء

زندگی

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا
شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں
تنگ دستی کا کیا گلہ کیجے

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے
ان کو تشویشِ روزگار کہاں؟
درد بیچیں گے گیت گائیں گے
اس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟

جام چھلکا تو جم گئی محفل
منّتِ لطفِ غمگسار کسے؟
اشک ٹپکا تو کھل گیا گلشن
رنجِ کم ظرفیٔ بہار کسے؟

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد
دَیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی
نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے
جائے تسخیرِ کائنات کرے

جون ۵۹ء

○
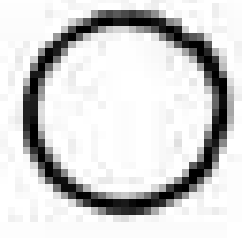
ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کروگے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

جولائی ۵۹ء

○
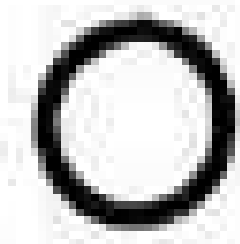
آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سِل گئے ہونٹ، کوئی زخم سِلے یا نہ سِلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کِھل گئے زخم، کوئی پھول کِھلے یا نہ کِھلے

اپریل ۱۹۶۲ء

○
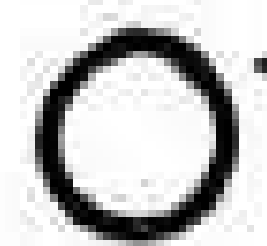
ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دنوں
کِھلتی ہے صبح گُل کی طرح رنگ و بُو سے پُر
ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا
دل آرزو سے پُر کرو، آنکھیں لہو سے پُر

○
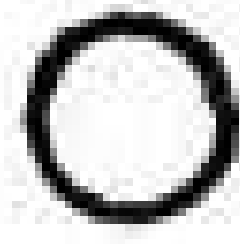
کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

کب مہکے گی فصلِ گل کب بہکے گا مے خانہ
کب صبحِ سخن ہوگی کب شامِ نظر ہوگی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

دو مرثیے

(۱)

ملاقات مری

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ دام
راستے بجھ گئے رخصت ہُوئے رہگیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہُوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اِک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اِک نظر زہر لیے ایک نظر میں دارو

دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
فرقتِ درد میں بے آب ہُوا تختہ داغ
کس سے کہیے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری
آشنا موت جو دشمن بھی ہے غمخوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

(۲)

ختم ہُوئی بارشِ سنگ

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سمت اندھیرا نہ اُجالا ہوگا
بجھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قافلۂ درد کا اب کیا ہوگا

اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لیے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد"

نومبر ۱۹۶۰ء

○
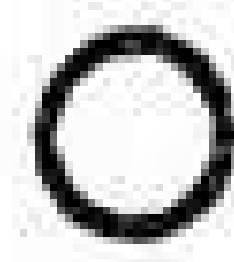
ان دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا، قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورتِ بربادیِ یاراں کیا ہے

○
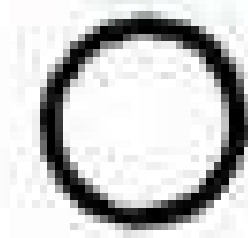
آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غم زدوں کو قرار آ گیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آ گئی جیسے پیغامِ دیدارِ یار آ گیا

جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم رُو برو پھر سرِ رہگزار آ گیا
صبحِ فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمرِ رفتہ ترا اعتبار آ گیا

رُت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گُل کِھلا، اشک اُمڈے کہ ابرِ بہار آ گیا

۶۰

خونِ عُشاق سے جام بھرنے لگے، دل سُلگنے لگے، داغ جلنے لگے
محفلِ درد پھر رنگ پر آگئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آگیا

سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

فیضؔ کیا جانیے یار کس آس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پر ہُوا محتسب مہرباں، دلفگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا

کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر میں لُٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے

عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی!

ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
اِس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
اِس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اِس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طور کہ پچھتاؤ گے
اِس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتۂ واماندگیٔ آخرِ شب
بھول کر ساعتِ درماندگیٔ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

دسمبر ۱۹۶۱ء

○
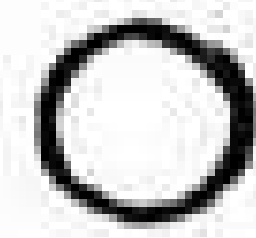
یک بیک شورشِ فغاں کی طرح
فصلِ گل آئی امتحاں کی طرح

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پُر ہُوا جامِ ارغواں کی طرح

یاد آیا جنونِ گم گشتہ
بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

جانے کس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

مئی ۱۹۶۲ء

شہرِ یاراں

آسماں کی گود میں دم توڑتا ہے طفلِ ابر

جم رہا ہے ابر کے ہونٹوں پہ خوں آلود کف

بجھتے بجھتے بجھ گئی ہے عرش کے حجروں میں آگ

دھیرے دھیرے بچھ رہی ہے ماتمی تاروں کی صف

اے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خوںناک شام

سر جھکائے جا رہی ہے شہرِ یاراں کی طرف

شہرِ یاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت

شیر دل بانکوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف

اِک طرف بجتی ہیں جوشِ زیست کی شہنائیاں
اِک طرف چنگھاڑتے ہیں اہرمن کے طبل و دف
جاکے کہنا اے صبا، بعد از سلامِ دوستی
آج شب جس دم گزر ہو شہرِ یاراں کی طرف
دشتِ شب میں اِس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں
ساقیٔ صبحِ طرب، نغمہ بلب، ساغر بکف
وہ پہنچ جائے تو ہوگی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیبِ مقام و منصب و جاہ و شرف

○
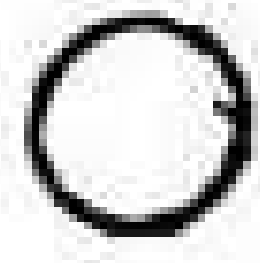
نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لُٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بُھلا دیا

اُدھر ایک حرف کہ کُشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

خوشا ضمانتِ غم

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر
رہِ یقیں تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پرنم کی آب و تاب کی خیر

روان رہے یہ روایت، خوشا ضمانتِ غم

نشاطِ ختمِ غمِ کائنات سے پہلے

ہر اک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم

کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے

سکوں ملے نہ کبھی تیرے پافگاروں کو

جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے

اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو

جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

لندن ۱۹۶۳ء

جب تیری سمندر آنکھوں میں

(گیت)

یہ دُھوپ کنارا، شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اِس دھوپ کنارے، پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک

۷۰

•

یہ میل ہمارا، جھوٹ نہ سچ
کیوں زار کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سُکھ سوئیں گے گھر دَر والے
اور راہی اپنی رہ لے گا

(لندن سے)
۱۹۶۳ء

رنگ ہے دل کا مرے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِّ نظر، راہگزر راہگزر شیشۂ مے شیشۂ مے

اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک،
رنگ ہے دل کا مرے، "خونِ جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتّوں کا، خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا دہکتے ہوگلزار کا رنگ

زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے،
کوئی بھیگا ہُوا دامن، کوئی دُکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہُوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِّ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

ماسکو
اگست ۱۹۶۳ء

پاس رہو

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے،
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہمِ مشک لیے، نشترِ الماس لیے
بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل

آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں

آس لیے

اور بچّوں کے بلکنے کی طرح قُلقُلِ مے

بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے

جب کوئی بات بنائے نہ بنے

جب نہ کوئی بات چلے

جس گھڑی رات چلے

جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے

پاس رہو

میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو!
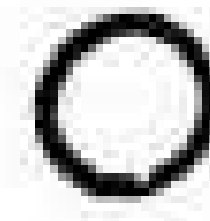
ماسکو
۱۹۶۳ء

○

تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت، نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہُوا ہے جب سے دلِ ناصبُور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

بمبئی ۱۹۵۶ء

○
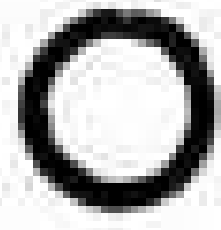
ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے

تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے

مے خانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے

یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیض، کبھی بخیہ گری نے

لندن ۱۹۶۳ء

○
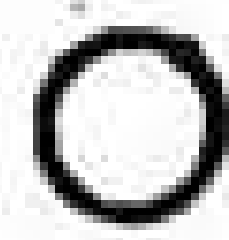
شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دلرُبا کے نام پہ خالی سبُو کریں

سینے پہ ہاتھ ہے نہ نظر کو تلاشِ بام
دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں

کب تک سنے گی رات، کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے روبرو کریں

ہمدم حدیثِ کوئے ملامت سُنائیو
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں

آشفتہ سر ہیں، محتسبو، منہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکرِ دل و جاں عدو کریں

"تر دامنی پہ شیخ، ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"

منظر

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھُلا، آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہُوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتّے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پھُوٹ گیا، آہستہ

بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
تم نے کہا، "آہستہ"
چاند نے جھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

ماسکو
۱۹۶۳ء

سرِ وادیِ سینا

مریم (سلگانیک) کے نام

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

فہرست

فیض

وی جی کیرنن

ترجمہ سحر انصاری

میں فیض سے کوئی بیس سال قبل اس وقت متعارف ہوا تھا جب وہ ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں لیکچرار تھے۔ ایک اور پرانے دوست جو اس وقت فیض کے رفیقِ کار تھے، کل اچانک ایڈنبرا میں دکھائی دیئے اور ان سے مل کر مجھے بیتے ہوئے دن یاد آگئے۔ معلوم یہ ہوا کہ فیض کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اُس قدیم دوست کی ایڈنبرا میں آمد سے مجھے مطلع کریں گے، لیکن وہ بھول گئے۔ اُس زمانے میں بھی وہ اپنی بھول جانے کی عادت اور غائب دماغی کی وجہ سے خاصے مشہور تھے۔ لیکن اُن کے طالب علم ان کی اس عادت کو آسانی سے درگزر کر دیتے تھے کیونکہ اگر کوئی پروفیسر یہ بھول جائے کہ اسے طلبہ کو لیکچر دینا تھا تو انھیں کبھی اس کا افسوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح تانگہ چلانے والوں کا بھی ان کے ساتھ یہی رویہ تھا کیونکہ وہ کسی کے گھر جا کر باتوں میں مصروف ہو جاتے اور بھول جاتے کہ باہر تانگہ کھڑا ہوا ہے اور اس طرح تانگے والوں کا کرایہ بڑھتا رہتا تھا۔ اور ادبی لوگ انھیں یوں معاف کر دیتے تھے کہ وہ اس وقت بھی ایک اہم شاعر تھے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اس ہفتے لندن میں ایک ادبی تقریب ان کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں خود وہاں حاضر

ہونے سے قاصر ہوں۔ گزشتہ بار کوئی پانچ سال قبل جب وہ انگلستان آئے تھے تو ایک ایسی ہی تقریب میں شریک ہونے کا مجھے شرف حاصل ہوا تھا۔ اس تقریب کے فوراً بعد فیض یورپ روانہ ہو رہے تھے تاکہ وطن واپس جا سکیں جہاں انھیں جیل میں ڈال کر ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ کئی ادبی شخصیتوں کی زندگی میں اس قسم کی خفیف غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ اِس بار وہ نسبتاً زیادہ طویل مدّت کے لیے انگلستان میں قیام کر رہے ہیں تاکہ خوش قسمتی سے ان کے دوستوں کو مستقبل قریب میں اسی قسم کی کسی اور غلط فہمی کا خوف باقی نہ رہے اور کسی محبِ وطن شاعر کو اپنے وطن سے خواہ کتنا ہی لگاؤ کیوں نہ ہو یہ امر خاصا دل خوش کن ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ (کسی دوست کی طرح) بہت قریب سے جائزہ لینے کے بجائے چار یا پانچ ہزار میل کے فاصلے سے اپنے وطن کے بارے میں غور و خوض کرے۔

یہ امر بلا شبہ افسوسناک ہے کہ مع اہل و عیال ہمارے یہاں کے متعدد پر سکون اور رومان انگیز مقامات مثلاً میرے آبائی شہر مانچسٹر یا لیک ڈسٹرکٹ جہاں ایک زمانے میں اتنے سارے شاعروں نے عروج پایا، یا سب سے بڑھ کر ایڈنبرا میں رہنے کے بجائے لندن میں سکونت اختیار کر رہے ہیں۔ اُسی شہر میں جو اینٹوں، کہر، شور و غل اور اہالیانِ لندن کا ایک دیو ہیکل مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر جانسن کہا کرتے تھے کہ جب آدمی لندن سے اُکتا جائے تو وہ زندگی سے اُکتا جاتا ہے لیکن یہ اٹھارویں صدی میں ہوتا تھا۔ آج تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جب آدمی زندگی سے اُکتا جائے تو وہ لندن کا رُخ کرتا ہے

فیض بابا کے سگریٹ نوش واقع ہوئے ہیں۔ یہ بُری عادت لندن کے کہر اور دھند کے ساتھ مل کر کہیں اُن کی انتہائی تابناک صلاحیتوں کو ماند نہ کر دے۔ تاہم مجھے کامل یقین ہے کہ اپنی بیوی اور بچیوں کی مدد سے وہ اس مسئلے پر قابو پا لیں گے۔ نیز یہ کہ ایک ادبی شخصیت کی حیثیت سے اُس ملک میں اُن کا قیام حقیقی معنوں میں تخلیقی ثابت

ہوگا۔ وہ اب تک بہت کچھ کر چکے ہیں لیکن انھیں ابھی اور بہت کچھ کرنا ہے۔ اور اب جبکہ وہ دوسرے ہنگاموں سے آزاد ہیں انھیں یقیناً خیال آئے گا کہ اُن سے کس قدر زیادہ توقع کی جاتی ہے۔ ان بیس برسوں میں مجھے یقین ہے کہ میں نے انھیں اس قسم کے موضوعات پر کم از کم بیس کتابیں لکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ جدید معاشرے میں فنکار کا مرتبہ، تاریخِ ادبِ اُردو یا مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کی نوعیت۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہر شخص کو جو ان سے واقف ہے فطری طور پر یہ توقع بھی ہوگی کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں مزید نظمیں لکھیں گے۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش بھی رہی ہے کہ وہ دوسرے ممالک کی بعض نظمیں خصوصاً ہمارے عہد کی ترقی پسند شاعری کا ترجمہ اُردو میں کریں جو اسی روایت یا عالمی تحریک سے تعلق رکھتی ہو جس سے خود ان کی شاعری وابستہ ہے۔ ویسے جارج بارو، جنھوں نے آئرستان، ڈنمارک اور دوسرے علاقوں کی شاعری کو انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، اپنی ایک کتاب لیونگرو (LAVENGRO) میں لکھتے ہیں کہ "ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک بازگشت ہی ہوتا ہے" تمام ترجمہ کرنے والے یقیناً یہی محسوس کرتے ہوں گے لیکن کچھ نہ ہونے سے بازگشت بھی بہرحال بہتر ہے اور فیض کی پیدا کردہ بازگشت کم از کم مترنم ضرور ہوگی۔ گزشتہ دنوں اُن سے یہ سُن کر میں بے حد متاثر ہوا کہ خود اُن کی بعض نظمیں سواحلی زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد مشرقی افریقہ میں پڑھی جا رہی ہیں۔ جہاں ایک ملک گیر زبان کی حیثیت سے سواحلی کا مستقبل بہت تابناک نظر آتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہی دوسری زبانوں میں بھی ان کے کلام کا ترجمہ ہو جائے گا۔

ایک اسکاٹ خاتون نے، جو کئی سال تک افغانستان میں رہی ہیں، فیض کے[*] والد کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جو اُس زمانے میں وہاں وزیرِ اعلیٰ تھے۔ مصنفہ کے بیان کے مطابق وہ بڑے پختہ عزم و ارادہ کے مالک تھے اور انتہائی انتشار کے ماحول میں نظم و نسق

---

[*] فیض کے والد سلطان محمد خاں امیر عبد الرحمٰن خاں والیٔ افغانستان کے دربار میں چیف سکرٹری کے عہدے پر مامور تھے۔

قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امرتسر کی آزادانہ زندگی کے زمانے سے فیضؔ بھی دوسرے متعدد باحوصلہ انسانوں کے دوش بدوش اس جد وجہد میں مصروف ہیں کہ ہمارے جدید عہد کے انتشار میں ضبط وتوازن قائم کیا جائے۔ جو کبھی کبھی افغانستان کے دورِ قدیم سے زیادہ مایوس کن نظر آتا ہے۔ میں ایک اور پشت کو سرگرم عمل دیکھنے کا خواہاں ہوں اور چشمِ تصور سے فیضؔ کی بیٹیوں کو اپنی اپنی رغبت کے عظیم کارناموں کی تکمیل میں منہمک دیکھ بھی رہا ہوں۔ ان میں ایک کو غالباً پاکستان کی پہلی عظیم مصورہ کی حیثیت سے اور دوسری کو شاید پہلی خاتون صدر کی حیثیت سے۔

دریں اثنا فیضؔ کے دوستوں کو ہر ہفتے کے خاتمے پر اُن سے دریافت کرتے رہنا چاہیے کہ انھوں نے کتنے صفحات لکھ لیے ہیں اور ہر روز شام کو معلوم کرتے رہنا چاہیے کہ انھوں نے کتنے سگریٹ کم پیے ہیں۔

۲۷ نیلس اسٹریٹ۔ ایڈنبرا
۵۔ دسمبر ۱۹۶۲ء

ایک حوصلہ مند دل کی آواز

الیگزانڈر ژُرکوف

ترجمہ سحر انصاری

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ماسکو میں دسمبر کی ایک سرمازدہ شام کو زندگی میں پہلی بار فیضؔ کے ان ولولہ خیز اشعار نے میرے دل میں اضطراب پیدا کیا تھا۔ ۱۹۵۴ء کا سال رخصت ہو رہا تھا اور برف کا ایک طوفان پُشکن کے سرمئی مجسمے کے گرد نغمہ ریز تھا۔ پہرہ دار سپاہی چوراہوں پر کھڑے سردی سے کانپ رہے تھے۔ ماسکو کے ایک گرم اور آرام دہ فلیٹ میں مشرقی سوویت کی دوست جمہوری ریاستوں کے شعرا اور بیرونی مشرقی ممالک سے آئے ہوئے مہمانوں کی محفل میں ہندوستان کے شاعر علی سردار جعفری ایک ناآشنا زبان کے اشعار تقریباً گنگنانے کے انداز میں پڑھ رہے تھے۔ اشعار سب کے دلوں کو مسحور کرتے جا رہے تھے۔ ان اشعار میں محبت کے نازک جذبوں کی کسک بھی، زنداں کی تنہا کوٹھڑی میں مقید انسان کا غمِ تمنا تھا اور ایک انقلابی کا شعلہ خیز

۱۴

غیظ و غضب بھی تھا۔ یہ اشعار فیض احمد فیض کے تھے جو ہماری صحبت میں شامل نہ ہو سکے تھے اور ماسکو سے بہت دور منٹگمری جیل میں تنہائی کے شب و روز بسر کر رہے تھے۔ اسی لمحہ شاید وہ سلاخوں سے باہر کا منظر دیکھ رہے ہوں گے، وہ رخشندہ ستاروں سے معمور آسمان کو تک رہے ہوں گے یا پھر شاید اپنے حوصلہ مند دلِ پرسوز کی گہرائی میں جنم لینے والے مصرعے سرگوشی کے انداز میں دہرا رہے ہوں گے۔

تین ماہ بعد — وقت وہی تھا جو ماسکو میں گزشتہ موسم سرما کی ہواؤں کی موجودگی میں تھا۔ میں نے ایک بار پھر ایسے اشعار سُنے جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور ان کے تاثر کی توانائی ہی سے مفہوم اور منزلیں طے ہونے لگتی ہیں۔

اس وقت میں دہلی میں تھا۔ مارچ کا آغاز تھا۔ سیاہ جنوبی آسمان پر بے شمار ستارے جھلملا رہے تھے اور اس پس منظر میں سدابہار درخت رات کی دھند میں ایستادہ نظر آ رہے تھے۔ لال قلعہ کی دور اُفتادہ اور سنگین دیواروں کے سائے میں گاڑیاں خاموشی سے گزر رہی تھیں اور رِکشا چھلاووں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ وہ سب اس مقام کی سمت رواں دواں تھے جہاں قمقموں سے روشن وسیع و عریض، رنگارنگ پنڈال، سبزے کے قطعات اور بے شمار رنگین پھولوں سے لدے ہوئے نامانوس درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

پنڈال میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے، شاعر مائیکروفون پر آتے رہے اور مشاعرے میں جان پڑتی رہی اور پھر جعفری نے چند ایسی نئی نظموں کا آغاز کیا جو منٹگمری جیل کے تنہا کمرے کی اداس اور سنگین دیواروں میں مقید رہ کر لکھی گئی تھیں اب فیض وہاں اپنی اسیری کا پانچواں سال گزار رہے تھے۔

رنگ برنگے پنڈال میں اچانک سناٹا اور ارتعاش پذیر سکوت چھا گیا۔ ہر لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔ ایک ایک لفظ دلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا اور ایسے مقامات پر جہاں شاعر کے اشعار احساس کی گہرائی میں ڈوب جاتے اور پھر غیظ و غضب

کی بازگشت بن کر اُبھرتے تو جیسے سارا پنڈال ایک دم بیدار ہو جاتا اور نغمہ گر کی آواز کے ساتھ ساتھ بڑے جوش و خروش سے داد دینے لگتا۔

اس وقت میں فیضؔ احمد فیضؔ کے بارے میں کیا جانتا تھا؟

یہی کہ اپنے عوام کو نو آبادیاتی نظام کی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں وہ جوانی کے زمانے سے ہی تن دہی کے ساتھ شامل ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں فاشزم سے اپنی نفرت کے اظہار کے لیے وہ بدیسی اینگلو انڈین فوج میں ایک افسر بن گئے تھے اور جنگ کے بعد کرنل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ وہ ایک پُرجوش صحافی تھے جو نوآبادیاتی شکنجے اور مقامی آقاؤں کی غلامی سے اپنے عوام کو آزاد کرانے کے تصورات کو فروغ دینے کے لیے جان و دل سے سرگرمِ عمل ہے۔

فیض اپنی سیاسی تحریروں اور ایک پُرخلوص انقلابی کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کے ذریعے پاکستان کے بہترین فرزندانِ وطن کے دوش بدوش بے غرضی اور جوش و خروش کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ رجعت پسند اس باکمال شاعر کی قوتِ صداقت اور توانائیِ الفاظ سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ عذابِ تنہائی اور جبری بیکاری کا شکار بنانے کے لیے اُنھوں نے منٹگمری اور حیدرآباد کی جیلوں میں فیض پر پانچ سال کی طویل اسیری مسلط کر دی تھی۔ لیکن شاعر کے زندہ اور حیات پرور دل کی دھڑکنوں پر سنگلاخ زندان کی تاریک رات غالب نہ آسکی اور نہ ایامِ اسیری کی بے حس اور جامد خاموشی ان کے نغموں پر کوئی مُہرِ سکوت ثبت کر سکی۔

زنداں کی سنگین دیواروں میں سے بھی ان کے حوصلہ مند دل سے وہ نغمے بیتاب ہو کر نکلتے رہے جو عوام، زندگی اور مادرِ وطن کی محبت سے لبریز تھے۔ اُن کے نغمات کے پیروں کی سرسراہٹ پاکستان اور متعدد دوسرے ممالک کی سرزمین پر سنائی دیتی رہی اور لاکھوں انسانوں کے دلوں کو گرماتی رہی۔

آخرکار رجعت پسندی کی تیرگی اور انقلابی شاعری کی روشنی کی جنگ میں

شاعری ہی کامران و فتح مند رہی ۔ خطرے اور وہ بھی موت کے مسلسل خطرے سے عبارت پانچ سال کی قید و بند کی صعوبتیں ختم ہوئیں اور محبِ وطن شاعر آزاد ہو گیا ۔ ایک بار پھر ماضی کی طرح ، بلکہ اس سے بھی زیادہ جوش اور ولولہ کے ساتھ اس جد و جہد کو جاری رکھنے کے لیے جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی ۔ اپنے ہموطنوں کے لیے تمام اقوام کے مابین دوستی کو فروغ دینے کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے امن کی فضا پیدا کرنے کے لیے ۔ اور اب زنگ خوردہ زنجیروں اور ہتھکڑیوں کی گرفت سے آزاد ہو کر وہ زیادہ توانائی اور جذبے کی سچائی کے ساتھ اپنے شعلہ صفت نغمات فضا میں بکھیر رہا ہے ۔

۱۹۵۸ء کے موسمِ خزاں کے بعد تاشقند میں افرو ایشیائی ادیبوں کا مشہور اجلاس ہوا جس میں فیض نے ایک مقتدر رہنما کی حیثیت سے شرکت کی ۔ وہاں ان سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی ۔ اس شاعر سے ملاقات ہوئی جس کا تصور میں اپنے دل میں بسائے ہوئے ۔۔۔ تھا ۔

فیض کے لیے وہ نسبتاً اداسی کا زمانہ تھا ۔ پاکستان میں حکومت کا تختہ الٹ کر غیر جمہوری طاقتوں نے اقتدار سنبھال لیا تھا ۔

ماسکو میں ادیبوں کی انجمن کے ایک کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے ۔ ہم دونوں نظمیں پڑھ رہے تھے اور روسی زبان میں فیض کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کی بابت بات چیت کر رہے تھے ۔ پھر اتفاق سے ہماری گفتگو کا رخ نظموں سے ہٹ کر اس وقت کی سیاست کی طرف ہو گیا ۔

تو پھر مستقبل قریب میں آپ کا کیا ارادہ ہے ؟

فیض نے اپنی سیاہ آنکھوں سے ، جن کی گہرائی میں قدرے اداسی تھی ، میری طرف دیکھا ۔ لیکن ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ موجود تھی ۔

ہ ہبر: پہلے تو میں لندن جاؤں گا ، وہاں اپنے بعض دوستوں سے ملوں گا

جو ابھی ابھی پاکستان سے آئے ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ میں کراچی، لاہور، اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا......"

"لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب وہاں ....."

ان کے ہونٹوں کے کناروں پر وہی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو مجھے وطن ہی واپس جانا چاہیے"

"تو پھر جیل یقینی ہے......"

"شاید..... اور اگر کسی بڑے مقصد کی خاطر انسان کو جیل بھی جانا پڑے تو ضرور جانا چاہیے۔"

"لیکن اگر..... جیل سے بھی بدتر کچھ ہو تو.....؟"

شاعر نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جہاں باغ کے وسط میں ٹالسٹائی کا مجسمہ نصب تھا، سرد اور خزاں زدہ آسماں پر نظر ڈالی۔ مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں آہستہ سے کہا۔

"اگر جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہوئی تو پھر یقیناً برا ہوگا۔ لیکن تم جانتے ہو جد وجہد بہر حال جد وجہد ہے......"

یہ تھا اُن کا پر سکون لیکن پر اعتماد جواب۔

میں اپنی زندگی میں ایسے متعدد افراد سے مل چکا ہوں۔ ان میں سے بہت سے نڈر، بیباک اور جرأت مند بھی تھے اور اپنی زندگی کے نصب العین کی تکمیل میں جان و دل سے منہمک بھی۔ وہ ہر قسم کی اذیت یہاں تک کہ ناگزیر موت برداشت کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے تھے

فیض میں یہ ضبط و تحمل اور یہ اعتماد، اذیت کوشی اور موت سے نبرد آزمائی کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ ایک ایسی موت جو جد وجہد کے لیے خود کو وقف کر دینے والوں کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔

تاہم مصائب و ابتلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جو جرأت

فیض میں بھی اس نے میرے سارے وجود کو ڈگمگا دیا۔

فیض کی شاعری کا ترجمہ کرنے کی غرض سے میں نے ان کا ایک ایک مصرعہ بڑے غور سے پڑھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو (ترجمہ شدہ) مصرعوں میں ترنم اور ان کے حساس اور حوصلہ مند دل کا جذبہ برقرار رہے۔ اس کوشش میں نہ صرف ان کے اشعار کا جذباتی زیر و بم، جسے دوسری زبان میں منتقل کرنا تقریباً ناممکن ہے، بلکہ ایک جانباز اور شاعر انسان کا پُرسکون اور واضح ضبط و تحمل میری روح میں گونجنے لگا۔ شاعر، جس نے ایک انقلابی کی حیثیت سے خود اپنی زندگی کو ایک نغمے میں ڈھال لیا اور اپنے نغمے کو جدوجہد کا ایک مؤثر ہتھیار بنالیا ہے۔ جدوجہد کے مراحل سے گزرتے ہوئے مشرق کے ایک ممتاز ترین ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کے ان نغمات کو سوویت قارئین سے روشناس کراتے ہوئے مجھے بے پایاں مسرت ہو رہی ہے۔

مطالعہ کے دوران فیض کی شاعری میں ابتلائے اسیری کا تاثر بھی محسوس ہوتا ہے۔ جس سے دل اُداس ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر شعلہ خیز جوش و جذبہ اس تاثر پر غالب آجاتا ہے۔

تیرگی کا استعارہ ان کی شاعری میں بار بار آتا ہے۔ لیکن وہ اشعار زیادہ تابناک ہیں جن میں شاعر کے وطن پر طلوع ہونے والی سحر کے نورِ اولین کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور مطالعہ کرنے والا یقیناً محسوس کرے گا کہ آزادی کی محبت اور شاعر کے مصائب زدہ وطن کو حقیقی شاعری کس طرح ہم آہنگ و ہم رنگ کر دیتی ہے۔

(روسی زبان میں مجموعۂ کلام کا دیباچہ ۱۹۶۲ء)

اِنتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا

زرد پتّوں کا بن

زرد پتّوں کا بن جو مرا دیس ہے

درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام

بادشاہِ جہاں، والیٔ ماسوا، نائب اللہ فی الارض

دہقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے

جس کی بیٹی کو ڈاکو اُٹھا لے گئے

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے

دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے

جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے

دھجیاں ہو گئی ہے

اُن دکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں میں سنبھلتے نہیں
دُکھ بتاتے نہیں
منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

ان حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گُل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھِل کھِل کے
مرجھا گئے ہیں
ان بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبّت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے ہیں

بیواؤں کے نام

"کٹڑیوں"[1] اور گلیوں، محلّوں کے نام

جن کی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں

کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو

جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا

آنچلوں کی حنا

چوڑیوں کی کھنک

کاکلوں کی مہک

آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو

پڑھنے والوں کے نام

وہ جو اصحابِ طبل و علم

کے دروں پر کتاب اور قلم

[1] کٹڑی کٹڑے کی تصغیر۔ پنجابی میں ملحقہ مکانوں کے احاطے کو کہتے ہیں

کا تقاضا ہے، ہاتھ پھیلائے
پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے
وہ معصوم جو بھولپن میں
وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
لے کے پہنچے جہاں
بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے انت راتوں کے سائے

اُن اسیروں کے نام
جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں
آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گُل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں

(ناتمام)

١٩٦٥ء

لہو کا سُراغ

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخیِ لبِ خنجر نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبّا نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خوںبہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے

سرِ وادیِ سینا

۲۸

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی عَلم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا، بے آسرا، یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدّعی، نہ شہادت، حساب پاک ہُوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہُوا

کراچی
جنوری ۱۹۶۵ء

❖
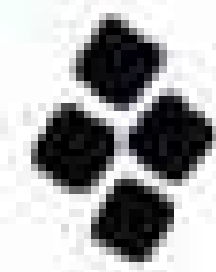
زنداں زنداں شورِ انا الحق، محفل محفل قلقلِ مے
خونِ تمنّا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم شہر بہ شہر

کراچی
جنوری ۱۹۶۵ء

(گلاب کا پھول سابق صدر ایوب خاں کا انتخابی نشان تھا)

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب اُن کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

کراچی
جنوری ۱۹۶۵ء

یہاں سے شہر کو دیکھو

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل
ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو کوئی تیز چلے رہ تو پوچھتا ہے خیال
کہ ٹوکنے کوئی للکار کیوں نہیں آئی
جو کوئی ہاتھ ہلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک، کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی؟

سرِ وادیٔ سینا
۳۲

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں، نہ کوئی والیٔ ہوش
ہر ایک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
ہر اک حسینۂ رعنا، کنیزِ حلقہ بگوش

جو سائے دُور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبُو
جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کُھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

کراچی
مارچ ۱۹۶۵ء

○
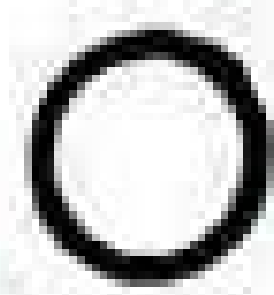
یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

سایۂ چشم میں حیراں رُخِ روشن کا جمال
سرخیٔ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ

بے پیے ہوں کہ اگر لطف کرو آخرِ شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ

چنگ و نَے رنگ پہ تھے، اپنے لہو کے دم سے
دل نے لَے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ

اک سخن اور کہ پھر رنگِ تکلّم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

کراچی ۱۹۶۵ء

غم نہ کر، غم نہ کر

درد تھم جائے گا غم نہ کر، غم نہ کر
یار لوٹ آئیں گے، دل ٹھہر جائے گا، غم نہ کر، غم نہ کر
زخم بھر جائے گا،
غم نہ کر، غم نہ کر
دن نکل آئے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
ابر کھل جائے گا، رات ڈھل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر
رُت بدل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر

جون ۱۹۶۵ء

بلیک آؤٹ

جب سے بے نور ہوئی ہیں شمعیں

خاک میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں نہ جانے کس جا

کھو گئی ہیں میری دونوں آنکھیں

تم جو واقف ہو بتاؤ کوئی پہچان مری

اس طرح ہے کہ ہر اک رگ میں اُتر آیا ہے

موج در موج کسی زہر کا قاتل دریا

تیرا ارمان، تری یاد لیے جان مری

جانے کس موج میں غلطاں ہے کہاں دل میرا

۳۶

ایک پل ٹھہرو کہ اُس پار کسی دنیا سے
برق آئے مری جانب، یدِ بیضا لے کر
اور مری آنکھوں کے گم گشتہ گہر
جامِ ظلمت سے سیہ مست
نئی آنکھوں کے شب تاب گہُر
لوٹا دے
ایک پل ٹھہرو کہ دریا کا کہیں پاٹ لگے
اور نیا دل میرا
زہر میں ڈھل کے، فنا ہو کے
کسی گھاٹ لگے
پھر پئے نذر نئے دیدہ و دل لے کے چلوں
حسن کی مدح کروں، شوق کا مضمون لکھوں

ستمبر ۱۹۶۵ء

○
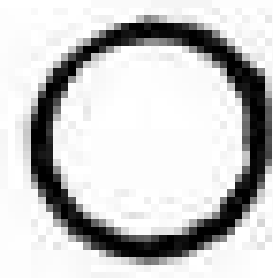
کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غمّاز کیا
اعلانِ جنوں دل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو، جب چھیڑی شوق کی لَے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

بے حرص و ہوا، بے خوف و خطر، اِس ہاتھ پہ سر، اُس کف پہ جگر
یوں کوئے صنم میں وقتِ سفر نظّارۂ بامِ ناز کیا

جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہم رنگِ گلِ طنّاز کیا

لو وصل کی ساعت آپہنچی، پھر حکمِ حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا

سپاہی کا مرثیہ

اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو
جاگو میرے لال،
اب جاگو میرے لال
تمری سیج سجاون کارن
دیکھو آئی رین اندھیارن
نیلے شال دوشالے لے کر
جن میں اِن دُکھیَن اَکھیَن نے

ڈھیر کیے ہیں اتنے موتی
اتنے موتی جن کی جیوتی
دان سے تمرا
جگ جگ لاگا
نام چمکنے
اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال
گھر گھر بکھرا بھور کا کندن
گھور اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکے ہیں
بالی دُلھنیا، بانکے ویرن
سُونا تمرا راج پڑا ہے
دیکھو کتنا کاج پڑا ہے

بیری بیرا جے راج سنگھاسن

تم ماٹی میں لال

اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو، جاگو میرے لال

ہٹ نہ کرو ماٹی سے اُٹھو، جاگو میرے لال

اب جاگو میرے لال

اکتوبر ۱۹۶۵ء

١٩٦٦ء

ایک شہر آشوب کا آغاز

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے

اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے

گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے

رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

پیوندِ رہِ کوچۂ زر چشمِ غزالاں،

پابوسِ ہوس افسرِ شمشاد قداں ہے

یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں

واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف

مُہر اُس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن

اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

فروری ۱۹۶۶ء

❖
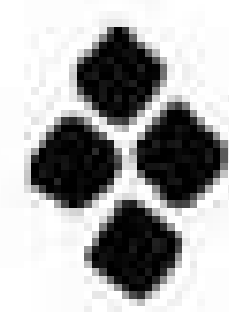
دیوارِ شب اور عکسِ رُخِ یار سامنے
پھر دل کے آئینے سے لہو پھوٹنے لگا
پھر وضعِ احتیاط سے دُھندلا گئی نظر
پھر ضبطِ آرزو سے بدن ٹوٹنے لگا

۱۹۶۶ء

○
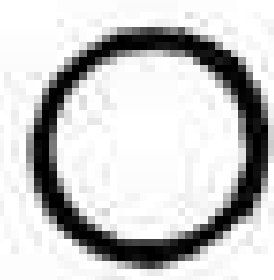
کیے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شب و روزِ آشنائی مہ و سال تک نہ پہنچے

وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

ترا لطف وجہِ تسکیں، نہ قرار شرحِ غم سے
کہ ہیں دل میں وہ گلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

سرِ وادیِ سینا
۴۶

کوئی یارِ جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیمِ یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

چلو فیضؔ دل جلائیں کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

۱۹۶۶ء

۱۹۶۷ء

سوچنے دو

(آندرے وزنیسن سکی کے نام)

اِک ذرا سوچنے دو
اِس خیاباں میں
جو اِس لحظہ بیاباں بھی نہیں
کون سی شاخ میں پھُول آئے تھے سب سے پہلے
کون بے رنگ ہُوئی رنج و تعب سے پہلے
اور اب سے پہلے

کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا
گُل کی شہ رگ پہ کڑا
وقت پڑا
سوچنے دو

اِک ذرا سوچنے دو
یہ بھرا شہر جو اَب وادیٔ ویراں بھی نہیں
اس میں کس وقت کہاں
آگ لگی تھی پہلے
اس کے صف بستہ دریچوں میں سے کس میں اوّل
زہ ہوئی سرخ شعاعوں کی کماں
کس جگہ جوت جگی تھی پہلے
سوچنے دو

سرِ وادیٔ سینا

۵۱

ہم سے اُس دیس کا تم نام و نشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوبِ گزشتہ کی طرح
روبرو آنے سے جی گھبرائے
ہاں مگر جیسے کوئی
ایسے محبوب یا محبوبہ کا دل رکھنے کو
آنکلتا ہے کبھی رات بِتانے کے لیے
ہم اب اُس عمر کو آپہنچے ہیں جب ہم بھی یونہی
دل سے مل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لیے
دل کی کیا پوچھتے ہو
سوچنے دو

ماسکو
مارچ ۱۹۶۷ء

۵۲

○
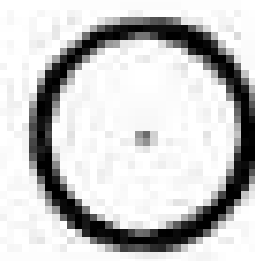
نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے
نہ کرم ہے ہم پہ حبیب کا، نہ نگاہ ہم پہ عدو کی ہے

صفِ زاہداں ہے تو بے یقیں، صفِ میکشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح درود و وضو کی ہے، نہ وہ شام جام و سبو کی ہے

نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا، کہ تری جفا کا گلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب، یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے

کفِ باغباں پہ بہارِ گل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن میں نمود میرے لہو کی ہے

نہیں خوفِ روزِ سیہ ہمیں، کہ ہے فیض ظرفِ نگاہ میں
ابھی گوشہ گیر وہ اک کرن، جو لگن اس آئینہ رو کی ہے

۱۹۶۷ء

سرِ وادیٔ سینا

(عرب اسرائیل جنگ کے بعد)

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا، اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفّا کرو، اس لوح پہ شاید

سرِ وادیٔ سینا
۵۴

مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اُترے

اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے

دُعا

آئیے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسمِ دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بُت، کوئی خدا یاد نہیں

آئیے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے
وہ جنھیں تابِ گراں باریٔ ایام نہیں
اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رُخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع مُنوّر کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
اُن کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کر دے

جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمّتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سِرِّ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

۱۴؍ اگست ۱۹۶۷ء

یومِ آزادی

دلدار دیکھنا

طوفاں بہ دل ہے ہر کوئی دلدار دیکھنا
گُل ہو نہ جائے مشعلِ رخسار دیکھنا
آتش بہ جاں ہے ہر کوئی سرکار دیکھنا
لَو دے اُٹھے نہ طرّۂ طرّار دیکھنا
جذبِ مسافرانِ رہِ یار دیکھنا
سر دیکھنا، نہ سنگ، نہ دیوار دیکھنا
کوُئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آگئے تو گرمیِ بازار دیکھنا

اُس دل نواز شہر کے اطوار دیکھنا
بے التفات بولنا، بیزار دیکھنا

خالی ہیں گرچہ مسند و منبر نگوں ہے خلق
رُعبِ قبا و ہیبتِ دستار دیکھنا

جب تک نصیب تھا ترا دیدار دیکھنا
جس سمت دیکھنا، گُل و گلزار دیکھنا

پھر ہم تمیزِ روز و مہ و سال کر سکیں
اے یادِ یار پھر اِدھر اک بار دیکھنا

سنہ ۱۹۶۷ء

ہارٹ اٹیک

درد اتنا تھا کہ اس رات دلِ وحشی نے
ہر رگِ جاں سے الجھنا چاہا،
ہر بُنِ مُو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دور ترے صحن میں گویا
پتّا پتّا مرے افسردہ لہو میں دُھل کر
حسنِ مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا
میرے ویرانۂ تن میں گویا

سارے دُکھتے ہُوئے ریشوں کی طنابیں کھُل کر
سلسلہ وار پتا دینے لگیں
رُخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا
اور جب یاد کی بجھتی ہُوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل آخری لمحہ تری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی، مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

۱۹۶۷ء

۱۹٦۸ء

❖
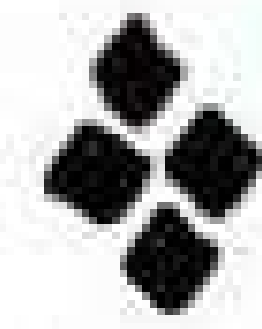
ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

سنہ ۱۹۶۸ء

مرثیے

(۱)

دُور جا کر قریب ہو جتنے
ہم سے کب تم قریب تھے اتنے
اب نہ آؤ گے تم نہ جاؤ گے
وصل و ہجراں بہم ہُوے کتنے

(۲)

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا

دولتِ لب سے پھر اے خسروِ شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا

گرمیٔ رشک سے ہر انجمنِ گُل بدناں
تذکرہ چھیڑے تری پیرہن آرائی کا

صحنِ گلشن میں کبھی اے شہِ شمشاد قداں
پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا

ایک بار اور مسیحائے دلِ دل زدگاں
کوئی وعدہ، کوئی اقرار مسیحائی کا

دیدہ و دل کو سنبھالو کہ سرِ شامِ فراق
ساز و سامان بہم پہنچا ہے رسوائی کا

اگست ۱۹۶۸ء

(۳)

کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے

بیتا دید اُمید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل، کب برکھا برساؤ گے

عہدِ وفا یا ترکِ محبت، جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے، ان کو کیا جتلاؤ گے

فیضؔ دلوں کے بھاگ میں ہے، گھر بھرنا بھی لُٹ جانا بھی
تم اُس حُسن کے لطف و کرم پر کتنے دن اِترا ؤ گے

اکتوبر ۱۹۶۶ء

۱۹۶۹ء

خورشیدِ محشر کی لَو

آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
دُور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن
کُھل کے ہنسنے کے دن گیت گانے کے دن
پیار کرنے کے دن، دل لگانے کے دن

آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں

آج کا دن زبوں ہے، مرے دوستو
آج کے دن تو یوں ہے، مرے دوستو
جیسے درد و الم کے پُرانے نشاں
سب چلے سُوئے دل کارواں، کارواں
ہاتھ سینے پہ رکھو تو ہر استخواں
سے اُٹھے نالۂ الاماں، الاماں

آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
کب تمہارے لہو کے دریدہ عَلَم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اُٹھّے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں دُھل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے درد و الم سارے جور و ستم
دُور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لَو
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

مارچ، اپریل ۶۹ء

١٩٧٠ء

❖
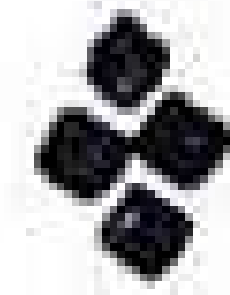
بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے
یا شمع پگھل رہی ہے
پہلو میں کوئی چیز جل رہی ہے
تم ہو کہ مری جان نکل رہی ہے

مئی - جون ؁

❖
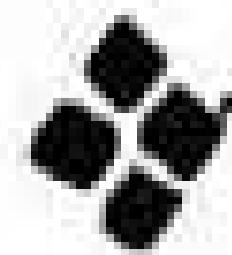
اِک سخنِ مطربِ زیبا کہ سلگ اُٹھے بدن
اِک قدحِ ساقیٔ مہوش جو کرے ہوش تمام
ذکرِ صبحے کہ رُخِ یار سے رنگیں تھا چمن
یادِ شبہا کہ تنِ یار تھا آغوش تمام

جون ؁

جرسِ گُل کی صدا

اس ہوس میں کہ پکارے جرسِ گل کی صدا
دشت و صحرا میں صبا پھرتی ہے یوں آوارہ
جس طرح پھرتے ہیں ہم اہلِ جنوں آوارہ

ہم پہ وارفتگیٔ ہوش کی تہمت نہ دھرو
ہم کہ رمّازِ رموزِ غمِ پنہانی ہیں
اپنی گردن پہ بھی ہے رشتہ فگن خاطرِ دوست
ہم بھی شوقِ رہِ دلدار کے زندانی ہیں

جب بھی ابروئے درِ یار نے ارشاد کیا
جس بیاباں میں بھی ہم ہوں گے چلے آئیں گے
در کھلا دیکھا تو شاید تمھیں پھر دیکھ سکیں
بند ہوگا تو صدا دے کے چلے جائیں گے

جولائی ۱۹۷۰ء

فرشِ نومیدیٔ دیدار

دیکھنے کی تو کسے تاب ہے لیکن اب تک
جب بھی اُس راہ سے گزرو تو کسی دکھ کی کسک
ٹوکتی ہے کہ وُہ دروازہ کھلا ہے اب بھی
اور اُس صحن میں ہر سُو یونہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدیٔ دیدار بچھا ہے اب بھی
اور کہیں یاد کسی دل زدہ بچّے کی طرح
ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھی ہے فریاد کناں

دل یہ کہتا ہے کہیں اور چلے جائیں جہاں
کوئی دروازہ عبث وا ہو، نہ بیکار کوئی
یادِ فریاد کا کشکول لیے بیٹھی ہو
محرمِ حسرتِ دیدار ہو دیوار کوئی
نہ کوئی سایۂ گل ہجرتِ گل سے ویراں

یہ بھی کر دیکھا ہے سو بار کہ جب راہوں میں
دیس پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
قافلے قامت و رخسار و لب و گیسو کے
پردۂ چشم پہ یوں اترے ہیں بے صورت و رنگ
جس طرح بند دریچوں پہ گرے بارشِ سنگ

سخنے وفا ۴۵۲؟

اور دل کہتا ہے ہر بار چلو لوٹ چلو
اس سے پہلے کہ وہاں جائیں تو یہ دُکھ بھی نہ ہو
یہ نشانی کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی
اور اس صحن میں ہر سُو یونہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدئ دیدار بچھا ہے اب بھی

اگست سنہ

ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند

رہا نہ کچھ بھی زمانے میں جب نظر کو پسند
تری نظر سے کیا رشتۂ نظر پیوند

ترے جمال سے ہر صبح پر وضو لازم
ہر ایک شب ترے در پر سجود کی پابند

نہیں رہا حرمِ دل میں اِک صنمِ باطل
ترے خیال کے لات و منات کی سوگند

مثالِ زینۂ منزل بکارِ شوق آیا
ہر اک مقام کہ ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند

سرِ وادیٔ سینا
۸۰

خزاں تمام ہوئی کس حساب میں لکھیے
بہارِ گُل میں جو پہنچے ہیں شاخِ گُل کو گزند

دریدہ دل ہے کوئی شہر میں ہماری طرح
کوئی دریدہ دہن شیخِ شہر کے مانند

شعار کی جو مداراتِ قامتِ جاناں
کیا ہے فیضِ درِ دل، درِ فلک سے بلند

نومبر ۷۰ء

۱۹۷۱ء

○
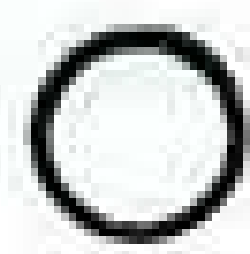
شرحِ بے دردیٔ حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی

پھر وہی وعدہ جو اقرار نہ بننے پایا!
پھر وہی بات جو اثبات نہ ہونے پائی

پھر وہ پروانے جنھیں اذنِ شہادت نہ ملا
پھر وہ شمعیں کہ جنھیں رات نہ ہونے پائی

پھر وہی جاں بلبی لذتِ مے سے پہلے
پھر وہ محفل جو خرابات نہ ہونے پائی

پھر دمِ دید رہے چشم و نظر دید طلب
پھر شبِ وصل ملاقات نہ ہونے پائی

پھر وہاں بابِ اثر جانیے کب بند ہُوا
پھر یہاں ختم مناجات نہ ہونے پائی

فیض سر پر جو ہر اک روز قیامت گزری
ایک بھی روزِ مکافات نہ ہونے پائی

۲۲ر مارچ سنہ ۷۱ء

حذر کرو مرے تن سے

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کسے لُبھائے گا میرے لہو کا واویلا
مرے نزار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
چراغ ہو کوئی روشن نہ کوئی جام بھرے
نہ اس سے آگ ہی بھڑکے نہ اس سے پیاس بجھے
مرے فگار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
مگر وہ زہرِ ہلاہل بھرا ہے نس نس میں
جسے بھی چھیدو ہر اک بوند قہرِ افعی ہے
ہر اک کشید ہے صدیوں کے درد و حسرت کی
ہر اک میں مُہر بلب غیظ و غم کی گرمی ہے

حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا تن وہ چوبِ صحرا ہے
جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے

بجائے سرو و سمن میری ہڈیوں کے ببول
اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی
بجائے مشکِ صبا، میری جانِ زار کی دھول
حذر کرو کہ مرا دل لہو کا پیاسا ہے

مارچ ۱۹۷۱ء

تہ بہ تہ دل کی کدورت
میری آنکھوں میں امنڈ آئی تو کچھ چارہ نہ تھا
چارہ گر کی مان لی
اور میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھو لیا
میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھو لیا
اور اب ہر شکل و صورت
عالمِ موجود کی ہر ایک شے
میری آنکھوں کے لہو سے اس طرح ہم رنگ ہے
خورشید کا کندن لہو
مہتاب کی چاندی لہو
صبحوں کا ہنسنا بھی لہو
راتوں کا رونا بھی لہو

ہر شجر مینارِ خوں، ہر پھول خوں دیدہ ہے
ہر نظر اک تارِ خوں، ہر عکس خوں مالیدہ ہے
موجِ خوں جب تک رواں رہتی ہے اس کا سرخ رنگ
جذبۂ شوقِ شہادت، درد، غیظ و غم کا رنگ
اور تھم جائے تو کجلا کر
فقط نفرت کا، شب کا، موت کا،
ہر اک رنگ کے ماتم کا رنگ
چارہ گر ایسا نہ ہونے دے
کہیں سے لا کوئی سیلابِ اشک
آبِ وضو
جس میں دُھل جائیں تو شاید دُھل سکے
میری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو

۸۔ اپریل ۱۹۷۱ء

○
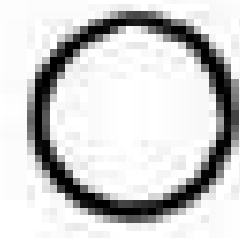
ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یوں ہی پذیرائی
جس بار خزاں آئی، سمجھے کہ بہار آئی

آشوبِ نظر سے کی ہم نے چمن آرائی
جو شے بھی نظر آئی، گل رنگ نظر آئی

امیدِ تلطف میں رنجیدہ رہے دونوں
تو اور تری محفل، میں اور مری تنہائی

یک جان نہ ہو سکیے، انجان نہ بن سکیے
یوں ٹوٹ گئی دل میں شمشیرِ شناسائی

اس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اے چشمِ تماشائی

یار اغیار ہو گئے ہیں ،
اور اغیار مُصِر ہیں کہ وہ سب
یارِ غار ہو گئے
اب کوئی ندیمِ باصفا نہیں ہے
سب رند شراب خوار ہو گئے ہیں

۱۹۷۱ء

غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آ لگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے

اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

کوئی دم بادبانِ کشتیٔ صہبا کو تہ رکھو
ذرا ٹھہرو، غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

خُمِ ساقی میں جز زہرِ ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے

ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ طوفاں ہے جو پل بھر بر لبِ ساحل ٹھہر جائے

نگاہِ منتظر کب تک کرے گی آئنہ بندی
کہیں تو دشتِ غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے

داغستان کے ملک الشعرا

رسول حمزہ کے افکار

میں تیرے سپنے دیکھوں

برکھا برسے چھت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں

برف گرے پربت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں

صبح کی نیل پری، میں تیرے سپنے دیکھوں

کویل دھوم مچائے، میں تیرے سپنے دیکھوں

آئے اور اُڑ جائے، میں تیرے سپنے دیکھوں

باغوں میں پتّے مہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں

شبنم کے موتی دہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں

اِس پیار میں کوئی دھوکا ہے
تو نار نہیں کچھ اور ہے شے
ورنہ کیوں ہر ایک سمے
میں تیرے سپنے دیکھوں

بھائی

آج سے بارہ برس پہلے بڑا بھائی مرا
اسٹالن گراڈ کی جنگاہ میں کام آیا تھا
میری ماں اب بھی لیے پھرتی ہے پہلو میں یہ غم
جب سے اب تک ہے وہی تن پہ ردائے ماتم
اور اس دُکھ سے مری آنکھ کا گوشہ تر ہے
اب مری عمر بڑے بھائی سے کچھ بڑھ کر ہے

داغستانی خاتون اور شاعر بیٹا

اس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
اس کی ہر بات میں سمجھتی تھی
اب وہ شاعر بنا ہے نامِ خدا
لیکن افسوس کوئی بات اس کی
میرے پلّے ذرا نہیں پڑتی

بہ نوکِ شمشیر

میرے آبا کہ تھے نامحرمِ طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر
روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم
سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

آرزو

مجھے معجزوں پہ یقیں نہیں مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزمِ دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اِذن دے
کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں
ترے در پہ آکے صدا کروں
تجھے غمگسار کی ہو طلب تو ترے حضور میں آ رہوں
یہ نہ ہو تو سُوئے رہِ عدم میں پھر ایک بار روانہ ہوں

سالگرہ

شاعر کا جشنِ سالگرہ ہے، شراب لا
منصب، خطاب، رتبہ انھیں کیا نہیں ملا
بس نقص ہے تو اتنا کہ ممدوح نے کوئی
مصرع کسی کتاب کے شایاں نہیں لکھا

ایک چٹان کے لیے

کتبہ

جواں مردی اُسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بُزدلی نے جست کی تھی

سرِ وادیِ سینا

۱۰۳

تیرگی جال ہے اور بھالا ہے نوٗر
اِک شکاری ہے دن، اِک شکاری ہے رات
جگ سمندر ہے جس میں کنارے سے دور
مچھلیوں کی طرح ابنِ آدم کی ذات
جگ سمندر ہے، ساحل پہ ہیں ماہی گیر
جال تھامے کوئی، کوئی بھالا لیے
میری باری کب آئے گی کیا جانیے
دن کے بھالے سے مجھ کو کریں گے شکار
رات کے جال میں یا کریں گے اسیر؟

نسخۂ الفت میرا

گر کسی طور ہر اک الفتِ جاناں کا خیال
شعر میں ڈھل کے ثنائے رُخِ جاناں نہ بنے
پھر تو یوں ہو کہ مرے شعر و سخن کا دفتر
طول میں طولِ شبِ ہجر کا افسانہ بنے
ہے بہت تشنہ مگر نسخۂ الفت میرا
اِس سبب سے کہ ہر اک لمحۂ فرصت میرا
دل یہ کہتا ہے کہ ہو قربتِ جاناں میں بسر

شامِ شہرِ یاراں

شامِ شہریاراں

مجید بھائی اور آمنہ بہن

کے نام

فہرست

فرمائشیں

پنجابی نظماں

تراجم

پیش گفتار

جب میں نے اس مجموعے کا مسودہ اشاعت کے لیے بھیجا تو اپنے دوست اور ناشر چودھری عبدالحمید صاحب کی جانب سے فرمائش وصول ہوئی کہ اس میں کچھ نثر کا بھی اضافہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ بقول اُن کے بعض لوگوں کو مصنّف کی ذات میں بھی دلچسپی ہے۔ ایک عزیز اور کرم فرما مرزا ظفرالحسن پہلے ہی سے اس کام کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انہی کے جمع کردہ مسالے کا کچھ حصّہ ان صفحات میں شامل کر دیا گیا ہے۔

فیض

عہدِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک

مرزا اظفر الحسن سے ایک گفتگو

ہمارے شعراء کو مستقلاً یہ شکایت رہی ہے کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ ناقدریٔ ابنائے وطن ہماری شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمیں اس سے الٹ شکایت یہ ہے کہ ہم پر لطف و عنایات کی اس قدر بارش رہی ہے، اپنے دوستوں کی طرف سے، اپنے ملنے والوں کی طرف سے اور ان کی جانب سے بھی جن کو ہم جانتے بھی نہیں کہ اکثر ندامت ہوتی ہے کہ اتنی داد و دہش کا مستحق ہونے کے لیے جو تھوڑا بہت کام ہم نے کیا ہے اس سے بہت زیادہ ہمیں کرنا چاہیے تھا۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ بچپن ہی سے اس قسم کا تاثر رہا ہے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے، اسکول میں پڑھتے تھے تو اسکول کے لڑکوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کے تعلقات قائم ہو گئے تھے خواہ مخواہ انھوں نے ہمیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا حالانکہ لیڈری کی صفات ہم میں نہیں تھیں، یا تو آدمی بہت لٹھ باز ہو کہ دوسرے اس کا رعب مانیں یا وہ سب سے بڑا فاضل ہو۔ ہم پڑھنے لکھنے میں ٹھیک تھے، کھیل بھی لیتے تھے لیکن پڑھائی میں ہم نے کوئی ایسا کمال پیدا نہیں کیا تھا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔

بچپن کا میں سوچتا ہوں تو ایک یہ بات خاص طور سے یاد آتی ہے کہ ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا۔ ہم جو تین بھائی تھے ان میں ہمارے چھوٹے بھائی (عنایت) اور بڑے بھائی (طفیل) خواتین سے باغی ہو کر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔ ہم اکیلے ان خواتین

کے ہاتھ آگئے۔ اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا اُجڈ قسم کی بات اس زمانے میں ہمارے مُنہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اب بھی نہیں نکلتی۔ نقصان یہ ہُوا، جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے کہ بچپن میں کھلنڈرے پن یا ایک طرح کے لہو و لعب کی زندگی گزارنے سے ہم محروم رہے۔ مثلاً یہ کہ گلی میں کوئی پتنگ اُڑا رہا ہے، کوئی گولیاں کھیل رہا ہے، کوئی لٹّو چلا رہا ہے، ہم بس کھیل کو دیکھتے رہتے تھے، اکیلے بیٹھ کر۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے کے مصداق ہم ان تماشوں کے صرف تماشائی بنے رہتے اور ان میں شریک ہونے کی ہمت اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ اسے شریفانہ شغل یا شریفانہ کام نہیں سمجھتے تھے۔

اساتذہ بھی ہم پر مہربان رہے۔ آج کل کی میں نہیں جانتا، ہمارے زمانے میں تو اسکول میں سخت پٹائی ہوتی تھی۔ ہمارے عہد کے اُستاد تو نہایت ہی جلاد قسم کے لوگ تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ان میں سے کسی نے ہم کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ ہر کلاس میں ہم کو مانیٹر بناتے تھے، بلکہ (ساتھی لڑکوں کو) سزا دینے کا منصب بھی ہمارے حوالے کرتے تھے۔ یعنی فلاں کو چانٹا لگاؤ، فلاں کو تھپڑ مارو۔ اس کام سے ہمیں بہت کوفت ہوتی تھی اور ہم کوشش کرتے تھے کہ جس قدر بھی ممکن ہو ہُوں سزا دیں کہ ہمارے شکار کو وہ سزا محسوس نہ ہو۔ طمانچے کی بجائے گال تھپتھپا دیا، یا کان آہستہ سے کھینچا وغیرہ۔ کبھی ہم پکڑے جاتے تو اُستاد کہتے یہ کیا کر رہے ہو زور سے چانٹا مارو۔

دو تاثر بہت گہرے ہیں ایک تو یہ کہ بچّوں کی جو دلچسپیاں ہوتی ہیں ان سے محروم رہے۔ دُوسرے یہ کہ اپنے دوستوں، ہم جماعتوں اور اپنے اساتذہ سے ہمیں بے پایاں شفقت اور خلوص ملا جو بعد کے زمانے کے دوستوں اور معاصرین سے ملا اور آج بھی مل رہا ہے۔

صبح ہم اپنے ابّا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ اذان

کے ساتھ ہم اُٹھ بیٹھے۔ ابا کے ساتھ مسجد گئے، نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے، درسِ قرآن سُنا، ابا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی سیر کے لیے گئے، پھر اسکول۔ رات کو ابا بُلا لیا کرتے خط لکھنے کے لیے۔ اس زمانے میں انھیں خط لکھنے میں کچھ دقت ہوتی تھی۔ ہم ان کے سیکرٹری کا کام انجام دیتے تھے۔ انھیں اخبار بھی پڑھ کر سُناتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہُوا۔ اُردو انگریزی اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہُوا۔

ایک اور یاد تازہ ہُوئی۔ ہمارے گھر سے ملی ہُوئی ایک دکان تھی، جہاں کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ ایک کتاب کا کرایہ دو پیسے ہوتا۔ وہاں ایک صاحب ہُوا کرتے تھے جنھیں سب بھائی صاحب کہتے تھے۔ بھائی صاحب کی دکان میں اُردو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع تھا۔ ہماری چھٹی ساتویں جماعت کی طالب علمی میں جن کتابوں کا رواج تھا وہ آجکل قریب قریب مفقود ہو چکی ہیں جیسے طلسمِ ہوشرُبا، فسانۂ آزاد، عبدالحلیم شرر کے ناول وغیرہ۔ یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں اس کے بعد شاعروں کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ داغ کا کلام پڑھا۔ میر کا کلام۔ غالب تو اس وقت بہت زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دُوسروں کا کلام بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا نہیں آتا تھا۔ لیکن ان کا دل پہ اثر کچھ عجب قسم کا ہوتا تھا۔ یُوں شعر سے لگاؤ پیدا ہُوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔

ہمارے ابا کے مُنشی گھر کے ایک طرح کے منیجر بھی تھے۔ ہمارا ان سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا تو انھوں نے کہا کہ اچھا آج ہم تمھاری شکایت کریں گے کہ تم ناول پڑھتے ہو۔ اسکول کی کتابیں پڑھنے کی بجائے چھپ کر اَنٹ شنٹ کتابیں پڑھتے ہو۔ ہمیں اس سے بہت ڈر لگا اور ہم نے ان کی بہت منت کی کہ شکایت نہ کریں مگر وہ نہ مانے اور ابا سے شکایت کر ہی دی۔ ابا نے ہمیں بُلایا اور کہا میں نے سُنا ہے تم ناول پڑھتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے ناول ہی پڑھنا ہے تو انگریزی ناول پڑھو اُردو کے ناول اچھے نہیں ہوتے۔

شامِ شہریاراں : ۱۴

شہر کے قلعہ میں جو لائبریری ہے وہاں سے ناول لا کر پڑھا کرو۔

ہم نے انگریزی ناول پڑھنے شروع کیے۔ ڈکنس، ہارڈی اور نہ جانے کیا کیا پڑھ ڈالا۔ وہ بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا پلّے نہ پڑتا تھا۔ اس مطالعہ کی وجہ سے ہماری انگریزی بہتر ہو گئی۔ دسویں جماعت میں پہنچنے تک محسوس ہُوا کہ بعض استاد پڑھانے میں کچھ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ ہم ان کی انگریزی درست کرنے لگے اس پر ہماری پٹائی تو نہ ہُوئی البتہ وہ اُستاد کبھی خفا ہو جاتے اور کہتے اگر تمھیں ہم سے اچھی انگریزی آتی ہے تو پھر تم ہی پڑھایا کرو ہم سے کیوں پڑھتے ہو۔

اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جیسے یکایک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں دُور چلی گئی ہیں۔ دُھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا، اس کی صُورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دُنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کے قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس کیفیت کا بعد میں بھی کبھی کبھی احساس ہُوا ہے مگر اب نہیں ہوتا۔

مشاعرے بھی ہُوا کرتے تھے۔ ہمارے گھر سے ملی ہُوئی ایک حویلی تھی جہاں سردیوں کے زمانے میں مُشاعرے کیے جاتے تھے۔ سیالکوٹ میں پنڈت راج نرائن ارمان ہُوا کرتے تھے جو ان مشاعروں کے انتظامات کرتے تھے۔ ایک بزرگ منشی سراج دین مرحوم تھے۔ علامہ اقبال کے دوست سری نگر میں مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ وہ صدارت کیا کرتے تھے۔

جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہم نے بھی تُک بندی شروع کر دی اور ایک دو مشاعروں میں شعر پڑھ دیے۔ منشی سراج دین نے ہم سے کہا میاں ٹھیک ہے تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو مگر یہ کام چھوڑ دو۔ ابھی تو تم پڑھو لکھو اور جب تمھارے دل و دماغ میں پختگی آ جائے تب یہ کام کرنا۔ اس وقت یہ تضییعِ اوقات ہے۔ ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔

جب ہم مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہُوئے اور وہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اردو پڑھانے آئے جو اقبال کے مفسر بھی ہیں تو انھوں نے مشاعرے کی طرح ڈالی اور کہا طرح پر شعر کہو۔ ہم نے کچھ شعر کہے اور ہمیں بہت داد ملی۔ چشتی صاحب نے منشی سراج دین کے بالکل خلاف مشورہ دیا اور کہا فوراً اس طرف توجہ کرو شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ۔

گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے جہاں بہت ہی فاضل اور مشفق اساتذہ سے نیازمندی ہوئی پطرس بخاری تھے، اسلامیہ کالج میں ڈاکٹر تاثیر تھے، بعد میں صوفی تبسم صاحب آگئے۔ ان کے علاوہ شہر کے جو بڑے ادیب تھے امتیاز علی تاج تھے، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری صاحب تھے۔ اختر شیرانی تھے ان سب سے ذاتی مراسم ہو گئے۔ ان دنوں اساتذہ اور طلبا کا رشتہ ادب کے ساتھ ساتھ کچھ دوستی کا سا بھی ہوتا تھا۔ کالج کی کلاسوں میں تو شاید ہم نے کچھ زیادہ نہیں پڑھا لیکن ان بزرگوں کی صحبت اور محبت سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی محفلوں میں ہم پر شفقت ہوتی تھی اور ہم وہاں سے بہت کچھ حاصل کر کے اٹھتے تھے۔

ہم نے اپنے دوستوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ جب شعر کہتے تو سب سے پہلے خاص دوستوں ہی کو سناتے تھے۔ ان سے داد ملتی تو مشاعروں میں پڑھتے۔ اگر کوئی شعر خود کو پسند نہ آیا یا دوستوں نے کہا نکال دو تو اسے کاٹ دیتے۔ ایم اے میں پہنچنے تک باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔

ہمارے ایک دوست ہیں خواجہ خورشید انور۔ ان کی وجہ سے ہمیں موسیقی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ خورشید انور پہلے تو دہشت پسند تھے، بھگت سنگھ گروپ میں شامل۔ انھیں سزا بھی ہوئی جو بعد میں معاف کر دی گئی۔ دہشت پسندی ترک کر کے وہ موسیقی کی طرف مائل ہوئے۔ ہم دن میں کالج جاتے اور شام کو خورشید انور کے والد خواجہ فیروزالدین مرحوم کی بیٹھک میں بڑے بڑے استادوں کا گانا سنتے۔ یہاں اس زمانے کے سب ہی استاد آیا کرتے تھے۔ استاد توکل حسین خاں، استاد عبدالوحید خاں، استاد عاشق علی خاں اور چھوٹے غلام علی خاں وغیرہ۔ ان استادوں کے ہم عصر اور ہمارے دوست رفیق غزنوی مرحوم

شامِ شہرِ یاراں

۱۶

سے بھی صحبت ہوتی تھی۔ رفیق لا کالج میں پڑھتے تھے۔ پڑھتے تو خاک تھے بس رسمی طور پر کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کبھی خورشید انور کے کمرے میں اور کبھی رفیق کے کمرے میں بیٹھک ہو جاتی تھی۔ غرض اس طرح ہمیں اس فنِ لطیف سے حظ اندوز ہونے کا کافی موقع ملا۔

جب ہمارے والد فوت ہوئے تو پتہ چلا کہ گھر میں کھانے تک کو کچھ نہیں ہے۔ کئی سال تک در بدر پھرے اور فاقہ مستی کی۔ اس میں بھی لطف آیا اس لیے کہ اس کی وجہ سے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کا بہت موقع ملا۔ خاص طور سے اپنے دوستوں سے کالج میں ایک چھوٹا سا حلقہ بن گیا تھا۔ کوئٹہ کے ہمارے دو دوست تھے احتشام الدین اور شیخ احمد حسین۔ ڈاکٹر حمید الدین بھی اِس حلقے میں شامل تھے۔ ان کے ساتھ شام کو محفل رہا کرتی۔ جوانی کے دنوں میں جو دُوسرے واقعات ہوتے ہیں وہ بھی ہوئے اور ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

گرمیوں میں تعطیلات ہوتیں تو ہم کبھی خورشید انور اور بھائی طفیل کے ساتھ سری نگر چلے جایا کرتے اور کبھی اپنی ہمشیرہ کے پاس لائل پور پہنچ جاتے۔ لائل پور میں باری علیگ اور ان کے گروہ کے دُوسرے لوگوں سے ملاقات رہتی۔ کبھی اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ کے ہاں دھرم سالہ چلے جاتے۔ جہاں منظرِ قدرت دیکھنے کا موقع ملتا اور دل پر ایک خاص قسم کا نقش ہوتا۔ ہمیں انسانوں سے جتنا لگاؤ رہا اتنا قدرت کے مناظر اور مطالعۂ حُسنِ فطرت سے نہیں رہا پھر بھی ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی محلے ہیں ان میں بھی اپنا ایک حُسن ہے جو دریا و صحرا، کوہسار یا سرو و سمن سے کم نہیں۔ البتہ اس کو دیکھنے کے لیے بالکل دُوسری طرح کی نظر چاہیے۔

مجھے یاد ہے ہم مستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدرو بہتی تھی۔ چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا۔ چار طرف باغات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا۔

چاندنی بدرو اور اردگرد کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پُراسرار منظر بن گئے تھے۔ چاند کی عنایت سے منظر کی بدوضعی چُھپ گئی تھی اور کچھ عجیب ہی قسم کا حُسن پیدا ہو گیا تھا۔ جسے میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے جب شہر کی گلیوں محلّوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا رُوپ آ جاتا ہے جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے۔ نیم شب، چاند، خود فراموشی، بام و در خامشی کے بوجھ سے چور وغیرہ اسی زمانے سے متعلق ہیں۔

ایم۔ اے میں پہنچے تو کبھی کلاس میں جانے کی ضرورت ہُوئی کبھی بالکل جی نہ چاہا۔ دُوسری کتابیں جو نصاب میں نہیں تھیں پڑھتے رہے۔ اس لیے امتحان میں کوئی خاص اعزاز حاصل نہیں کیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اوّل دوم آتے ہیں ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں خواہ ہمارے نمبر ان سے کم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات ہمارے اساتذہ بھی جانتے تھے جب کسی اُستاد کا، جیسے پروفیسر ڈکنسن یا پروفیسر ہریش چندر کٹا پالیا تھے، لیکچر دینے کو جی نہ چاہتا تو ہم سے کہتے ہماری بجائے تم لیکچر دو ایک ہی بات ہے۔ البتہ پروفیسر بخاری بڑے قاعدے کے پروفیسر تھے۔ وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر ڈکنسن کے ذمّے انیسویں صدی کا نثری ادب تھا مگر انھیں اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے ہم سے کہا دو تین لیکچر تیار کر لو۔ دوسرے جو دو تین لائق لڑکے ہمارے ساتھ تھے ان سے بھی کہا دو دو تین تین لیکچر تم لوگ بھی تیار کر دو۔ کتابوں وغیرہ کے بارے میں کچھ پُوچھنا ہو تو آ کے ہم سے پُوچھ لینا۔ چنانچہ نیم استاد ہم اسی زمانے میں ہو گئے تھے۔

ابتدائی شاعری کے دوران میں یا کالج کے زمانے میں ہمیں کوئی خیال ہی نہ گزرا کہ ہم شاعر بنیں گے۔ سیاست وغیرہ تو اس وقت ذہن میں بالکل ہی نہ تھی۔ اگرچہ اس وقت کی تحریکوں، مثلاً کانگریس تحریک، خلافت تحریک یا بھگت سنگھ کی دہشت پسند تحریک کے اثرات

شامِ شہر یاراں

۱۸

تو ذہن میں تھے۔ مگر ہم خود ان میں سے کسی قصے میں شریک نہیں تھے۔

شروع میں خیال ہوا کہ ہم کوئی بڑے کرکٹر بن جائیں کیونکہ لڑکپن سے کرکٹ کا شوق
تھا اور بہت کھیل چکے تھے۔ پھر جی چاہا استاد بننا چاہیے۔ ریسرچ کرنے کا شوق تھا۔
ان میں سے کوئی بات بھی نہ بنی۔ ہم کرکٹر بنے نہ نقاد اور نہ ریسرچ کیا۔ البتہ اُستاد ہو
کر امرت سر چلے گئے۔

ہماری زندگی کا شاید سب سے خوشگوار زمانہ امرت سر ہی کا تھا اور کئی اعتبار سے۔
ایک تو اس وجہ سے کہ جب ہمیں پہلی دفعہ پڑھانے کا موقع ملا تو بہت لطف آیا اپنے
طلبا سے دوستی کا لطف۔ ان سے ملنے اور روزمرہ کی رسم و راہ کا لطف۔ ان سے کچھ
سیکھنے اور انھیں پڑھانے کا لطف۔ ان لوگوں سے دوستی اب تک قائم ہے۔ دوسرے
یہ کہ اس زمانے میں کچھ سنجیدگی سے شعر لکھنا شروع کیا۔ تیسرے یہ کہ امرت سر ہی میں
پہلی بار سیاست میں تھوڑی بہت بصیرت اپنے کچھ رفقا کی وجہ سے پیدا ہوئی جن میں
محمود الظفر تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں تھیں، بعد میں ڈاکٹر تاثیر آ گئے تھے۔ یہ ایک نئی دنیا
ثابت ہوئی۔ مزدوروں میں کام شروع کیا۔ سول لبرٹیز کی ایک انجمن بنی تو اس میں کام
کیا۔ ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو اس کی تنظیم میں کام کیا۔ ان سب سے ذہنی تسکین
کا ایک بالکل نیا میدان ہاتھ آیا۔

ترقی پسند ادب کے بارے میں بحثیں شروع ہوئیں اور ان میں حصہ لیا۔ ادبِ
لطیف کی ادارت کی پیش کش ہوئی تو دو تین برس اس کا کام کیا۔ اس زمانے میں
لکھنے والوں کے دو بڑے گروہ تھے۔ ایک "ادب برائے ادب" والے، دوسرے ترقی پسند
تھے۔ کئی برس تک ان دونوں کے درمیان بحثیں چلتی رہیں جس کی وجہ سے کافی مصروفیت
رہی جو بجائے خود ایک بہت ہی دل چسپ اور تسکین دہ تجربہ تھا۔ برصغیر میں ریڈیو شروع
ہوا۔ ریڈیو میں ہمارے دوست تھے۔ ایک سید رشید احمد تھے جو ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل

ہوئے۔ دُوسرے سوم ناتھ چِپ تھے، جو آجکل ہندوستان میں شعبۂ سیاحت کے سربراہ
یں۔ دونوں باری باری سے لاہور کے اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ہم اور ہمارے ساتھ
شہر کے دو چار اور ادیب ڈاکٹر تاثیر، حسرت، صُوفی صاحب اور ہری چند اختر وغیرہ
ریڈیو آنے جانے لگے۔ اس زمانے میں ریڈیو کا پروگرام ڈائرکٹر آف پروگرامز نہیں بناتا تھا۔
ہم لوگ مل کر بنایا کرتے تھے۔ نئی نئی باتیں سوچتے تھے اور ان سے پروگرام مرتب کرتے
تھے۔ ان دنوں ہم نے ڈرامے لکھے، فیچر لکھے دو چار کہانیاں لکھیں، یہ سب ایک مُستقل
مشغلہ تھا۔ رشید جب دلّی چلے گئے تو ہم دہلی جانے لگے۔ وہاں نئے نئے لوگوں سے
ملاقاتیں ہوئیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے لکھنے والے گروہوں سے شناسائی ہوئی۔ مجاز، سردار
جعفری، جاں نثار اختر، جذبی اور مخدوم مرحوم سے ریڈیو کے توسط سے رابطہ پیدا ہوا جس
سے دوستی ۔ ؟ علاوہ بصیرت اور سُوجھ بُوجھ میں طرح طرح کے اضافے ہوئے۔ وہ سارا
زمانہ مصروفیت کا بھی تھا اور ایک طرح سے بے فکری کا بھی۔

(ناتمام)

فیض سے میری پہلی ملاقات

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

سن ۱۹۲۱ء تھا اور اکتوبر کا مہینہ۔ مجھے سنٹرل ٹریننگ کالج سے گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے کوئی تین ہفتے گزرے تھے۔ سابقہ درس گاہ کی خشک تدریسی فضا اور ضبط و نظم سے طبیعت گھٹی گھٹی سی تھی۔ نئے کالج میں آتے ہی طبیعت میں انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ ادب و شعر کا شوق پھر سے ابھرا۔ چنانچہ "بزمِ سخن" کی وساطت سے ایک بڑے مشاعرے کی صدارت پروفیسر پطرس بخاری کے سپرد ہوئی۔ شام ہوتے ہی کالج کا ہال طلبہ سے بھر گیا۔ اسٹیج کے ایک طرف نیاز مندانِ لاہور اپنی پوری شان سے براجمان تھے۔ مقابل میں لاہور کی تمام ادبی انجمنوں کے نمائندے صف آرا تھے۔ دونوں جانب سے خوش فوقی اور حریفانہ شگفتگی ایک دوسرے کا خیر مقدم کر رہی تھی۔

روایتی دستور کے مطابق صدر نے اپنے کالج کے طلبا سے شعر پڑھانے کا اعلان کیا۔ دو ایک برخوردار آئے اور بڑے ادب و انکسار سے کلام پڑھ کر چلے گئے۔ اچانک ایک دبلا پتلا، منحنی سا لڑکا اسٹیج پر نمودار ہوا، سیاہ رنگ، سادہ لباس، انداز میں متانت بلکہ خشونت، چہرے پر اجنبی ہونے کا شدید احساس۔ ادھر ادھر کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اتنے میں اس نے کہا، عرض کیا ہے۔ کلام میں ابتدا و مشق کے باوجود پختگی اور اسلوب میں برجستگی تھی۔ سب نے داد دی۔ یہ حفیظ ہوشیارپوری تھے۔

پھر ایک نوجوان آئے، گورے چٹے، کشادہ جبیں، حرکات میں شیریں رعنائی،

آنکھیں اور لب بیک وقت ایک نیم تبسم میں ڈوبے ہوئے۔ شعر بڑے ڈھنگ اور تمکنت سے پڑھے۔ اشارے ہوئے، پطرس نے کچھ معنی خیز نظروں میں لاہور کے نیاز مندوں سے باتیں کیں اور ان کی نیم خاموشی کو رضا سمجھ کر دونوں نوجوانوں کو دوبارہ اسٹیج پر بلایا۔ نیا کلام سُنا۔ فیض صاحب نے غزل کے علاوہ ایک نظم بھی سنائی۔ غزل اور نظم دونوں میں سوچ کا انداز اور بیان کا اچھوتا اسلوب تھا۔

مشاعرہ ختم ہوا۔ قرار پایا کہ احباب ان دونوں کو ہمراہ لے کر غریب خانے پر جمع ہوں۔ رات کافی گزر چکی تھی، انھیں بورڈنگ میں پہنچنا تھا۔ بخاری صاحب نے ان کی غیر حاضری کا ذمّہ لیا اور پھر گھنٹہ بھر کے لیے شعر و سخن کی صحبت قائم رہی۔ یہ ان کی طبع آزمائی کا امتحان نہیں، اساتذہ کی حوصلہ افزائی کا امتحان تھا۔ دونوں کامیاب رہے۔

ابھی پُورا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ کالج کے امتحانات کا آغاز ہوا۔ جس دن کی میں بات کر رہا ہوں اس دن پطرس کالج ہال میں مہتمم امتحانات تھے اور ہم جیسے نوتجربوں کو چھوٹے کمرے سپرد کیے گئے تھے۔ مجھے کالج کی دُوسری منزل میں متعین کیا گیا۔ یہاں ایم۔ اے انگلش کے طلبہ تھے اور ان میں فیض احمد فیض بھی تھے۔

امتحان کا کمرہ مقامِ احترام ہوتا ہے۔ اُمیدواروں کے ذہنی امتحان کے ساتھ ساتھ ضبط و نظم کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ میں نے اپنی عادت کو دبانے کے لیے پان کا انتظام کر لیا تھا۔ مگر فیض صاحب کبھی سوالات کے پرچے پر نظر ڈالتے اور کبھی میری طرف نیم متبسم نظروں سے دیکھتے اور پھر قلم کو اُٹھا کر سر کو کھجاتے اور کبھی خاموشی سے اپنے پڑوسیوں کی مزاج پرسی کرتے۔ کبھی کبھی ان کا بایاں ہاتھ لیے حرکت کرتا جیسے وہ کسی نامعلوم شے کو ٹٹول رہے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا۔ وہ اُٹھے اور کہا ہمیں یہاں سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟ میں نے کہا میں ابھی بتاتا ہوں۔

اتنے میں پطرس مختلف کمروں کا مُعائنہ کرتے کرتے میرے کمرے کے باہر آکر

کھڑے ہو گئے۔ میں تعظیماً پلیٹ فارم سے اُتر کر دروازے پر پہنچا، پوچھا: سب کچھ ٹھیک ہے؟
مَیں نے کہا جی!
مَیں نے عرض کیا، پروفیسر صاحب (میں انھیں پروفیسر صاحب کہا کرتا تھا)
بعض طلبہ سگریٹ پینا چاہتے ہیں۔ اجازت ہے؟
پطرس نے میرے کان میں دبی آواز میں کہا:
"جب تک پروفیسر جودھ سنگھ اس کالج کے پرنسپل نہیں بنتے۔ اس وقت تک پی سکتے ہیں" اور پھر مُسکرا کر چلے گئے۔
میں نے اندر آتے ہی فیض صاحب کی طرف دیکھا اور اشاروں سے سگریٹ نوشی کا اعلان کیا۔ فیض صاحب کے ہاتھ میں فی الفور ایک سگریٹ نمودار ہُوا۔ جیسے قلم ہی سے اُبھر آیا ہو۔
پھر قلم کے رَش اور سگریٹ کے کش میں مُقابلہ شروع ہُوا اور اس کش مکش میں مُعطّر دُھوئیں کے غُبارے پورے کمرے میں پھیل گئے۔ میں مُعلّم تھا، ضبط و نظم کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا بیٹھا رہا اور قوام دار پان کو چھوڑ کر اس خوشبو سے اپنے ذوقِ سگریٹ نوشی کی تسکین میں محو ہو گیا۔
کیا معلوم تھا کہ دُھوئیں کے یہ غبارے کالج کی چار دیواری سے دُور دُور تک فضا میں پھیل جائیں گے اور ان میں سگریٹ پینے والے کے مُعطّر انفاس کی خوشبوئیں بھی لہرائیں گی اور ہنر و فن اور ادب کی دُنیا کو اپنے آغوش میں لے لیں گی۔

ملامتی صُوفی

اشفاق احمد

میرا اور فیض صاحب کا نظریاتی اختلاف ہے۔ مَیں ایک شرعی آدمی ہوں اور فیض صاحب ملامتی صوفی ہیں۔ تاریخ میں ڈھونڈنے سے آپ کو کئی ایسی مثالیں مل جائیں گی جہاں ایک شرعی اور صوفی کی دوستی ہو گئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آخری منزلیں طے کیں لیکن ایک شرعی آدمی کی کسی ملامتی سے دوستی نہیں ہُوئی۔ فیض صاحب نے صوفی ازم کا اکتساب کسی سلسلہ میں بیعت کر کے نہیں کیا۔ نا ہی میرے اندازہ اور تحقیق کے مطابق انھوں نے ورد وظیفہ یا چلّہ کشی کی ہے۔ انھوں نے صُوفیا کا ایک تیسرا راستہ اختیار کیا ہے جو مجاہدے پر محیط ہے۔ اس کو بزرگانِ دین ادب اور تواضع کا نام دیتے ہیں۔

حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی فرماتے ہیں کہ ایک دم میں ولایت حاصل کرنے کے لیے ادب اور خدمت کو اختیار کرنا چاہیے۔ بزرگانِ دین اس کی تفصیل بیان کرتے ہُوئے کہتے ہیں کہ طریقِ تصوف کے طالب کو چاہیے کہ ادب ظاہری اور باطنی کو نگاہ میں رکھے۔ ادب ظاہری یہ ہے کہ مخلوقِ خدا کے ساتھ بحُسنِ ادب و کمال تواضع اور اخلاق کے ساتھ پیش آوے اور ادبِ باطنی یہ ہے کہ تمام اوقات و احوال و مقامات میں باحق رہے۔ حسنِ ادب ظاہر سرنامہ ادبِ باطن کا ہے اور حسنِ ادب ترجمانِ عقل ہے اور عقل چراغِ راہ کے صداقت کے تیل سے منور ہے۔

یہ ادب، یہ صبر، ایسا دھیما پن، اس قدر درگذر، کم سخنی اور احتجاج سے گریز۔ یہ صُوفیوں کے کام ہیں۔ ان سب کو فیض صاحب نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اُوپر سے ملامتی رنگ یہ اختیار رکیا ہے کہ اشتراکیت کا گھنٹہ بجاتے پھرتے ہیں کہ کوئی قریب نہ آئے اور محبوب کا راز نہ کھل

جائے۔ واہ بابا مل واہ! کیا کہنے: چوری کر، تے بھن گھر رب دا اوس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ۔

میرا تعلق چونکہ اُونچے خانوادے سے ہے اور میں مسلمان بادشاہوں کا پرستار ہوں اور ملوکیت کو ہی اسلام سمجھتا ہوں، اس لیے میری اور بابا مل کی نہیں بن سکتی۔ لیکن کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے، خاموش اور چُپ چاپ، میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر فیض صاحب حضور سرورِ کائنات کے زمانے میں ہوتے تو اُن کے چہیتے غلاموں میں سے ہوتے۔ جب بھی کسی بدزبان، تُند خو، بداندیش یہودی دوکاندار کی درازدستی کی خبر پہنچتی تو حضور کبھی کبھی ضرور فرماتے: "آج فیض کو بھیجو، یہ بھی دھیما ہے، صابر ہے، بُردبار ہے، احتجاج نہیں کرتا، پتھر بھی کھا لیتا ہے — ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے!"

اشفاق احمد

فیض سے میری رفاقت

شیر محمد حمید

۱۹۲۹ء کی بات ہے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تیسرے سال کا طالب علم تھا۔ چودھری نبی احمد اور آغا عبدالحمید میرے دوست تھے۔ ہم سب نیو ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ہر شام ہم سیر کو نکلتے تو ایک نوجوان کو دیکھتے جو باہر بنگلے کے پاس تنہا کھڑا گرد و پیش سے بے خبر کالج ٹاور کی سمت نظریں جمائے 'دُور کہیں اُفق کی بلندیوں کو دیکھ رہا ہوتا۔ اس کا سراپا دلکش اور محویت جاذب نظر تھی۔ تین چار دنوں کے بعد نبی احمد کے ذوقِ جستجو نے ہمیں اس نوجوان سے ہمکلام ہونے پر آمادہ کر لیا۔ قریب جا کر نبی احمد نے پوچھا "معاف کیجیے گا، آپ کون ہیں اور یُوں گم سم تنہا کھڑے کیا دیکھا کرتے ہیں؟" نوجوان محویت کے عالم سے چونکا اور کہنے لگا "میرا نام فیض ہے۔ میں نے مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے پاس کر کے یہاں تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا ہے۔ یہاں میرا کوئی واقف آشنا نہیں ہے"۔ نبی احمد نے معاً کہا "آئیے آج سے آپ ہمارے دوست ہیں' یہ شیر محمد حمید ہیں۔ یہ آغا حمید ہیں' یہ بھی آپ کے ہم جماعت ہیں"۔ وہ دن اور آج کا دن، ایک کم پچاس برس بیت چکے ہیں' زندگی ہزاروں نشیب و فراز سے گزری، فیض کی دوستی کا وہ بندھن بدستور برقرار ہے اور یہ دوستی ہمارے لیے فخر و مسرت کا باعث رہی ہے۔

فیض کے والد خان بہادر سلطان محمد خاں سیالکوٹ کے سرکردہ وکیل، مُعزّز و ممتاز شہری، ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین تھے۔ وجاہت و شرافت کا پیکر تھے، گھر میں ہر طرح کی آسودگی تھی۔ فیض نے ناز و نعمت میں آنکھ کھولی تھی، لاڈ پیار میں پرورش اور گھر یلو رکھ رکھاؤ اور ناز برداریوں

میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ لاہور آئے تو ماحول مختلف پایا۔ کچھ گھٹے گھٹے رہتے۔ ہمیں کافی جدوجہد کرنا پڑی کہ فیض اپنے خول سے باہر نکلیں پھر سات ماہ کے بعد ہم کامیاب ہوئے اور فیض حلقۂ احباب میں پھیلنے لگے۔

وہ زمانہ گورنمنٹ کالج کا سنہری دَور تھا۔ بڑے بڑے نامور اساتذہ مختلف شعبوں کے سربراہ تھے۔ پروفیسر ڈینگ ہارن انگریزی کے صدرِ شعبہ تھے۔ تھرڈ ایئر کے امتحان میں اُنھوں نے ہمارے انگریزی کے پرچے دیکھے۔ پرچے واپس ملے تو فیض کے پرچے پر ایک سو پینسٹھ نمبر درج تھے، کسی طالب علم نے پروفیسر صاحب سے پُوچھا ان کو ڈیڑھ سو میں سے ایک سو پینسٹھ نمبر کیسے مل گئے؟ جواب ملا:

فیض کی انگریزی دانی کے متعلق ایک نامور انگریز استاد کے یہ الفاظ سند رہیں گے۔

انہی دنوں پطرس بخاری کیمبرج سے فارغ التحصیل ہو کر گورنمنٹ کالج آئے۔ کالج کی علمی و ادبی دُنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ بخاری اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی دلفریب شخصیت کا پرتَو کالج کے ہر شعبے پر پڑا۔ کالج میں "بزمِ سخن" نام کی ایک اردو انجمن موجود تھی۔ اس کے اجلاس مشاعروں اور رسمی تعاریب تک محدود تھے۔ بخاری صاحب نے ناکافی سمجھ کر "مجلس" کے نام سے ایک نئی انجمن کا اجرا کیا۔ اردو علم و ادب سے شغف رکھنے والے طلبا کو چُن چُن کر اس کا رکن بنایا۔ فیض، راشد، آغا حمید، نبی احمد، حفیظ ہوشیارپوری اور یہ خاکسار اس کے بانی اراکین میں سے تھے۔ طالب علموں کے علاوہ بخاری صاحب کے ایما اور دعوت پر لاہور کے برگزیدہ ادیب و دانشور شریکِ مجلس ہوتے۔ ڈاکٹر تاثیر، مولانا سالک، امتیاز علی تاج، صوفی تبسم، چراغ حسن حسرت، بالالتزام اور حفیظ جالندھری کبھی کبھار تشریف لاتے۔ اجلاس اکثر و بیشتر بخاری کے دولت کدے پر ہوتے۔ ایک طالب علم مقالہ پڑھتا، ایک دو نظم یا غزل پیش کرتے، پھر سوال و جواب تنقید و تبصرے کا دور چلتا۔ صاحبِ مقالہ کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی اور نئے نئے گوشوں کی طرف رہنمائی بھی۔ موضوع کے ہر پہلو کو کھنگالا جاتا۔ اور مشرق و مغرب کے اسالیبِ تنقید، قدیم و جدید اصولوں کے

معیار پر پرکھا جاتا۔ غرض کوئی زاویہ، کوئی پہلو نظرانداز نہ کیا جاتا۔ اس دوران زمامِ بحث اکثر بخاری کے چابکدست ہاتھوں میں رہتی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کی یہ نشست مہینوں کی دیدہ ریزی پر حاوی ہوتی۔ ہم لوگ انشراحِ قلب کی کیفیت لیے واپس لوٹتے۔ یہ بخاری کی کرشمہ زائی تھی کہ مدفون امکانات کو اُجاگر کر کے فیض اور راشد جیسے نامور اکابرِ مجلس نے پیدا کیے۔

فیض میں شاعری کا مادہ فطری و وہبی تھا۔ ہم لوگوں میں بھی فیض کی صحبت اور بخاری، تاثیر اور تبسم جیسے جید اساتذہ کے التفاتِ نظر کے باعث شعروادب سے کچھ لگن پیدا ہوگئی۔ احباب کا حلقہ وسیع ہو چکا تھا۔ ہر شام ہوسٹل کے کسی کمرہ میں محفلِ مشاعرہ برپا کر بیٹھتے۔ طرح مصرع پر ہر کوئی دو چار شعر لکھ کر لاتا۔ محفل کے اختتام پر ہر غزل میں شعر انتخاب کر کے ایک غزل مرکب تیار کر لیتے جو کالج کے مجلّہ راوی میں احباب کے نام سے چھپتی۔ ظاہر ہے اس غزلِ مرکب میں حصہ وافر فیض کا ہوتا۔ "دی احباب" کے عنوان سے ایک طنز یہ فیض نے راوی میں لکھا تھا جو اب اُن کی کتاب "متاعِ لوح و قلم" میں شامل ہے۔

فیض کی شاعری پروان چڑھتی رہی۔ بین الکلیاتی مشاعروں میں فیض اکثر انعامات سمیٹتے رہے۔ ابھی کالج کا زمانہ تھا کہ فیض صفِ شاگرداں سے اٹھ کر مجلسِ اساتذہ میں شریک ہو گئے اور بخاری، تاثیر اور تبسم کے احباب میں جگہ پالی۔

ہم فورتھ ایئر میں تھے۔ دسمبر کی چھٹیوں میں فیض کی ہمشیرہ کی شادی تھی، وہ سیالکوٹ چلے گئے۔ اُن کے والد اس تقریب کی تیاری میں مصروف تھے۔ جس صبح برات کو آنا تھا اُسی رات حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اُن کا انتقال ہو گیا۔ اس قیامت کا اندازہ کیجیے جو اس ناگہانی موت سے ان کے خاندان پر گزر گئی۔ فیض نے ایک فقرہ کا خط لکھا: "تمہارا فیض یتیم ہو گیا" ان حشر سامانیوں کو کون سمجھے جو اس ایک فقرہ کی تہہ میں موجود ہیں۔ اس سانحۂ عظیم نے گویا زندگی کی بساط اُلٹ دی۔ فیض کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ اس کے قلب و ذہن میں ایک انقلاب آگیا۔ یہاں سے اس کی سوچ اور فکر کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری نے بھی نیا رُخ

اختیار کیا۔ غمِ جاناں کے ساتھ غمِ روزگار کا جاں گسل پیوند لگ جانے سے سوچ کے دھارے نئی سمت میں بہنے لگے۔

فیض نے انگریزی اور عربی میں ایم اے کر لینے کے بعد ایم اے او کالج میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ وہاں ڈاکٹر تاثیر بطور پرنسپل اور صاحبزادہ محمود الظفر بطور وائس پرنسپل آ گئے۔ صاحبزادہ کی معروف رفیقۂ حیات ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے زمرے کے دوسرے لوگوں سے میل جول بڑھا تو فکر و نظر کو اور وسعت ملی۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا اجرا انہی دنوں ہُوا۔ فیض اس کے بانی رکن ہیں۔ اب وہ غمِ جاناں اور غمِ روزگار سے گزر کر غمِ وطن اور غمِ جہاں کی سنگلاخ راہوں پر چل نکلے۔ اپنی ذات کا دُکھ عالمگیر دکھ کے سامنے ہیچ اور اس آفاقی دُکھ کا ایک معمولی حصہ نظر آیا۔ فیض وطن دوستی اور انسان دوستی کی جس راہ پر گامزن ہوئے اس میں ہزار آفتوں کا سامنا تھا۔ جسم و جان کی قربانیاں درکار تھیں۔ الحمدللہ کہ فیض کبھی مصیبت کا سامنا کرنے سے نہیں ہچکچایا۔ نگارِ وطن کی حرمت آزادی اور پھر تزئین و تجمیل کے شوق نے جس جس قربانی کا تقاضا کیا، پیش کر دی۔ یہ راہ طویل بھی ہے اور کٹھن بھی، لیکن راہروِ عشق کے قدموں میں نہ لغزش آئی اور نہ تھکن محسوس کی ـــــ

تحریکِ آزادی کا یہ جیالا تحریکِ پاکستان کے معرکوں میں بھی ہراول رہا۔ پاکستان ٹائمز کے اجرا پر مُدیرِ اعلیٰ مقرر ہُوا تو صحافتی محاذ پر قلمی جہاد کے معرکے سر کرتا رہا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو تعمیرِ وطن کے مراحل سامنے آئے۔ جس پاکستان کے خواب دیکھے تھے۔ ان کی تعبیر حسبِ مُراد نظر نہ آئی تو احتجاج کی صدا بلند کی۔ اور اربابِ اقتدار کو یہ طرزِ نوا پسند نہ آئی تو سازش کیس میں دھر لیے گئے اور قید و بند کے مُصائب جھیلنا پڑے۔ سازش کیس کا مُعما کیا تھا؛ اس کے متعلق نہ کبھی ہم نے دریافت کیا اور نہ ہی فیض نے بتایا۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ ؎

۳۱

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری تھی

اچانک گرفتاری، خوف و دہشت کی فضا، قیدِ تنہائی اور پھر سنٹرل جیل میں مقدمے کی سماعت، عجب گومگو کا عالم تھا۔ فیض کے اعزہ اور اقربا دوست احباب سب پریشان تھے۔ فیض کے بڑے بھائی حاجی طفیل احمد، جو بیرسٹر بھی کرم فرما تھے، حیدرآباد جیل میں فیض سے ملاقات کو گئے اور وہیں حرکتِ قلب رُک جانے سے انتقال کر گئے۔ میں تعزیت اور دلجوئی کے لیے فیض سے ملنے حیدرآباد گیا۔ جیل کے اندر ملاقات ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ مقدمے کی سنگینی، جیل کی مصیبت اور اب شفیق بھائی کی ناگہانی موت نے فیض کو سخت مضمحل اور بدحال کر رکھا ہوگا۔ میں یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا کہ فیض کی ظاہری شکل و صورت میں کسی غیر معمولی تبدیلی کے آثار نظر نہ آئے۔ اضمحلال و پریشانی کا کوئی خاص نشان نہ تھا۔

فیض ٹھنڈے مزاج کے بے حد صلح پسند آدمی ہیں، بات کتنی بھی اشتعال انگیز ہو، حالات کتنے بھی ناسازگار ہوں وہ نہ برہم ہوتے ہیں اور نہ مایوس۔ سب کچھ تحمل اور خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ نہ کوئی شکوہ نہ کسی کا گلہ نہ چڑچڑاہٹ نہ بدگوئی۔ میں نے فیض کو نہ کبھی طیش میں دیکھا ہے اور نہ کبھی کسی کا شکوہ شکایت کرتے سنا ہے۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں لاکھ ہیجان برپا ہوں، چہرے پر برہمی کی یا پریشانی کی کوئی لکیر نظر نہ آئے گی۔ فیض کا ظرف کتنا وسیع ہے، سمندر کی تہہ میں طوفانوں کی رستاخیز ہے، سطح پُرسکون ہے۔ یہ عظمت ہر کسی کو کہاں نصیب!

ہر معتدل آدمی کی طرح فیض پر بھی عشق و محبت کے حادثے گزرے ہیں۔ کچھ عام نوعیت کے رومانی واقعات جن کا دیرپا اثر فیض کی زندگی اور شاعری پر نہیں پڑا لیکن دو ایک واردات اس قدر شدید تھیں کہ فیض کے قلب و جگر کو برما کے رکھ گئیں۔ "نقش فریادی" کی نظمیں رقیب سے، ایک راہ گزر پر، ایک ایسے ہی حادثہ کی یادگار ہیں جس کا اختتام مرگ

سوزِ محبت پر ہُوا۔ ایسے حادثے ہر کسی پر گزرتے ہیں لیکن فیض جیسے حُسن بیں اور حُسن آفریں حساس فنکار پر ان کے جو گہرے اثرات مترتب ہُوئے ان کا سُراغ جا بجا ان کی شعری تخلیقات میں مل جاتا ہے۔

میرے نزدیک فیض کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں ایلس جارج سے ان کی شادی ہے۔ یہ بظاہر ایک مشرقی نوجوان کا ایک فرنگی نژاد خاتون سے نکاح ہے۔ ایسے نکاح آئے دن ہوتے رہتے ہیں، لیکن حقیقتاً یہ مشرقی قلب و رُوح اور مغربی جسم و دِل کا وہ بارآور پیوند ہے جس نے مشرق و مغرب کی رعنائیاں یک جا کر دی ہیں۔ فیض ایک لاابالی بے نیازِ این و آں اور خود فراموش سا نوجوان تھا۔ ایلس نے اس کی زندگی میں تربیت اور سنوار پیدا کر دی۔ اس کی بیقرار رُوح کو ایک حسین قالب میسّر آ گیا۔ ایلس نے مغرب اور اس کی تہذیبی روایات کو خیرباد کہہ کر مشرق اور اس کی ثقافتی اقدار کو اپنا لیا۔ دیس کے ساتھ بھیس اور وطن کے ساتھ زبان تک بدل لی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ایلس نے فیض کے فکر و نظر، جذبات و حیات اور آدرش تک اپنا لیے۔ قید و بند کی جن جن آزمائشوں سے فیض گزرے ہیں، ایلس کی غم خواری اور حوصلہ مندی کے بغیر ان جاں لیوا مراحل سے یوں اعتماد اور یقینِ محکم کے ساتھ گزرنا مشکل ہوتا۔

فیض کا پیدائشی شہر سیالکوٹ ہے۔ رہائشی شہر لاہور کہہ لیجیے لیکن ہم جانتے ہیں کہ لائلپور سے بھی اُن کو نسبتِ خاص ہے۔ ان کی جوانی کی کئی حسین یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں ان کے مدّاح اور پرستار ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ موجود ہیں لیکن لائل پور کے باسی ان سے دوگونہ التفات کے مستحق ہیں۔ اس لیے یہ آرزو کرنا کوئی بڑی جسارت نہ ہو گی کہ فیض ہمیں دل کے کسی محفوظ اور مخصوص گوشے میں جگہ دیے رکھیں۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

(اقبال)

اشعار

جو پیرہن میں کوئی تار محتسب سے بچا
دراز دستیِ پیرِ مغاں کی نذر ہُوا
اگر جراحتِ قاتل سے بخشوا لائے
تو دل سیاستِ چارہ گراں کی نذر ہُوا

جس روز قضا آئے گی

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور کبھی اوّلِ شب
بے طلب پہلے پہل مرحمتِ بوسۂ لب
جس سے کھُلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دُور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے

۲

شاید اس طرح کہ جس طور کبھی آخرِ شب
نیم وا کلیوں سے سر سبز سحر
یک بیک حجرۂ محبوب میں لہرانے لگے
اور خاموش دریچوں سے بہ ہنگامِ رحیل
جھنجھناتے ہوئے تاروں کی صدا آنے لگے

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور تہِ نوکِ سناں
کوئی رگ واہمۂ درد سے چلّانے لگے
اور قزّاقِ سناں دست کا دھندلا سایہ
از کراں تا بہ کراں دہر پہ منڈلانے لگے

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہو گی یہی حرفِ وِدع کی صورت
للّٰہِ الحمد بانجامِ دلِ دل زدگاں
کلمۂ شکر بنامِ لبِ شیریں دہناں

○
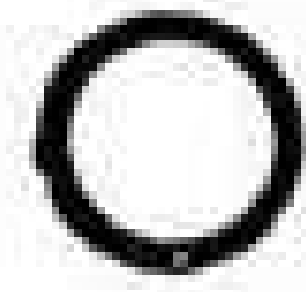
ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمھارے تھے

رنگ و خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

تیرے قول و قرار سے پہلے
اپنے کچھ اور بھی سہارے تھے

جب وہ لعل و گہر حساب کیے
جو ترے غم نے دل پہ وارے تھے

شامِ شہرِ یاراں
۴۰

میرے دامن میں آگرے سارے
جتنے طشتِ فلک میں تارے تھے

عمرِ جاوید کی دُعا کرتے
فیض اتنے وہ کب ہمارے تھے

۱۹۷۲ء

قطعہ

ہزار درد شبِ آرزو کی راہ میں ہے
کوئی ٹھکانہ بتاؤ کہ قافلہ اُترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوقِ دید مٹے
شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ اُترے

۱۹۷۲ء

اشک آباد کی شام

جب سورج نے جاتے جاتے
اشک آباد کے نیلے اُفق سے
اپنے سنہری جام
میں ڈھالی
سرخیٔ اوّلِ شام
اور یہ جام
تمھارے سامنے رکھ کر
تم سے کیا کلام

• اشک آباد ترکمان جمہوریہ کا صدر مقام ہے

شامِ شہر یاراں
۴۴

کہا پر نام

اُٹھو

اور اپنے تن کی سیج سے اُٹھ کر

اِک شیریں پیغام

ثبت کرو اس شام

کسی کے نام

کنارِ جام

شاید تم یہ مان گئیں اور تم نے

اپنے لبِ گلفام

کیے انعام

کسی کے نام

کنارِ جام

یا شاید

تم اپنے تن کی سیج پہ سج کر

یقیں ہوں محوِ آرام
کہ رستہ تکتے تکتے
بجھ گئی شمعِ جام
اشک آباد کے نیلے اُفق پر
غارت ہو گئی شام

۱۹۷۲ء

مرے درد کو جو زباں ملے

مرا درد نغمۂ بے صدا
مری ذات ذرّۂ بے نشاں
مرے درد کو جو زباں ملے
مجھے اپنا نام و نشاں ملے
مری ذات کا جو نشاں ملے
مجھے رازِ نظمِ جہاں ملے
جو مجھے یہ رازِ نہاں ملے
مری خامشی کو بیاں ملے
مجھے کائنات کی سروری
مجھے دولتِ دو جہاں ملے

۱۹۷۳ء

پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو

ہم کیا کرتے کس رہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
اُن رشتوں کے جو چھوٹ گئے
اُن صدیوں کے یارانوں کے
جو اِک اِک کر کے ٹوٹ گئے
جس راہ چلے، جس سمت گئے
یوں پاؤں لہولہان ہوئے

سب دیکھنے والے کہتے تھے
یہ کیسی ریت رچائی ہے
یہ مہندی کیوں لگائی ہے
وہ کہتے تھے، کیوں قحطِ وفا
کا ناحق چرچا کرتے ہو
پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو!
یہ راہیں جب اٹ جائیں گی
سو رستے اِن سے پھُوٹیں گے
تم دل کو سنبھالو جس میں ابھی
سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے

۱۹۷۳ء

سجّاد ظہیر کے نام

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غمہائے وطن پر اشکباری
سُنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر

"بنامِ شاہدِ نازک خیالاں"
بیادِ مستئ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایّامِ زنداں

صبا اور اس کا اندازِ تکلّم
سحر اور اس کا آغازِ تبسّم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحر گہ اب اُسی کے نام ساقی
کریں اِتمامِ دورِ جام ساقی
بساطِ بادہ و مینا اُٹھا لو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

دہلی ستمبر ۱۹۷۲ء

اے شام مہرباں ہو!

اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو
دوزخی دوپہر ستم کی
بے سبب ستم کی
دوپہر درد و غیظ و غم کی
بے زباں درد و غیظ و غم کی
اِس دوزخی دوپہر کے تازیانے

شامِ شہرِ یاراں
۵۱

آج تن پر دھنک کی صورت
قوس در قوس بٹ گئے ہیں
زخم سب کھل گئے ہیں
داغ جانا تھا چھٹ گئے ہیں
ترے توشے میں کچھ تو ہو گا
مرہم درد کا دوشالہ
تن کے اُس انگ پر اُڑھا دے
درد سب سے سوا جہاں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو

دوزخی دشت نفرتوں کے
بے درد نفرتوں کے

کرچیاں دیدۂ حسد کی
خس و خاشاک رنجشوں کے
اتنی سنسان شاہراہیں ،
اتنی گنجان قتل گاہیں
جن سے آئے ہیں ہم گزر کر
آبلہ بن کے ہر قدم پر
یوں پاؤں کٹ گئے ہیں
رستے سمٹ گئے ہیں
مخملیں اپنے بادلوں کی
آج پاؤں تلے بچھا دے
شافیِ کربِ رہرواں ہو
اے شام مہرباں ہو

اے مہرِ شبِ نگاراں
اے رفیقِ دلفگاراں
اِس شام ہمزباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو

۱۹۷۴ء

گیت

چلو پھر سے مُسکرائیں
چلو پھر سے دل جلائیں
جو گزر گئی ہیں راتیں
انھیں پھر جگا کے لائیں
جو بسر گئی ہیں باتیں
اُنھیں یاد میں بُلائیں
چلو پھر سے دل لگائیں
چلو پھر سے مسکرائیں

کسی شہ نشیں پہ جھلکی
وہ دھنک کسی قبا کی
کسی رگ میں کسمسائی
وہ کسک کسی ادا کی
کوئی حرفِ بے مروّت
کسی کُنجِ لب سے پھُوٹا
وہ چھنک کے شیشۂ دل
تہِ بام پھر سے ٹوٹا
یہ مِلن کی نا مِلن کی—
یہ لگن کی اور جلن کی
جو سہی ہیں وارداتیں
جو گزر گئی ہیں راتیں
جو بسر گئی ہیں باتیں

شامِ شہرِ یاراں

۵۶

کوئی ان کی دُھن بنائیں
کوئی ان کا گیت گائیں
چلو پھر سے مسکرائیں
چلو پھر سے دل جلائیں

۱۹۷۴ء

ہم تو مجبور تھے اِس دل سے

ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس میں ہر دم
گردشِ خوں سے وہ کہرام بپا رہتا ہے
جیسے رندانِ بلا نوش جو مل بیٹھیں بہم
میکدے میں سفرِ جام بپا رہتا ہے
سوزِ خاطر کو ملا جب بھی سہارا کوئی
داغِ حرمان کوئی، دردِ تمنا کوئی
مرہمِ یاس سے مائل بہ شفا ہونے لگا
زخمِ اُمید کوئی پھر سے ہرا ہونے لگا

۵۸

ہم تو مجبور تھے اِس دل سے کہ جس کی ضد پر

ہم نے اُس رات کے ماتھے پہ سحر کی تحریر

جس کے دامن میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا

ہم نے اس دشت کو ٹھہرا لیا فردوس نظیر

جس میں جُز صنعتِ خونِ سرِ پا کچھ بھی نہ تھا

دل کو تعبیر کوئی اور گوارا ہی نہ تھی

کلفتِ زیست تو منظور تھی ہر طور مگر

راحتِ مرگ کسی طور گوارا ہی نہ تھی

۱۹۷۴ء

○
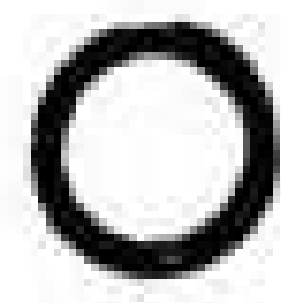
نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غم گسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا

جدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہُوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کیا کیا

پہنچ کے در پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے
اگرچہ رہ میں ہوئیں جگ ہنسائیاں کیا کیا

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

ستم پہ خوش کبھی لطف و کرم سے رنجیدہ
سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا

۱۹۷۴ء

ڈھاکہ سے واپسی پر

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

اُن سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

۱۹۷۴ء

○
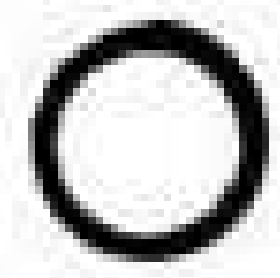
یہ موسمِ گل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گل و لالہ غم انگیز بہت ہے

خوش دعوتِ یاراں بھی ہے یلغارِ عدو بھی
کیا کیجیے دل کا جو کم آمیز بہت ہے

یوں پیرِ مغاں شیخِ حرم سے ہوئے یک جاں
میخانے میں کم ظرفیِ پرہیز بہت ہے

اِک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اِک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

کیوں مشعلِ دل فیضؔ چھپاؤ تہِ داماں!
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے ۱۹۷۵ء

بہار آئی

بہار آئی تو جیسے یکبار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے تھے
جو مٹ کے ہر بار پھر جیے تھے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مُشکبو ہیں
جو تیرے عشاق کا لہو ہیں

اُبل پڑے ہیں عذاب سارے

ملالِ احوالِ دوستاں بھی

خمارِ آغوشِ مہ وشاں بھی

غبارِ خاطر کے باب سارے

ترے ہمارے

سوال سارے جواب سارے،

بہار آئی تو کھُل گئے ہیں

نئے سرے سے حساب سارے

اپریل ۱۹۷۵ء

تم اپنی کرنی کر گزرو

اب کیوں اُس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے

یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنّا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اُجڑ گئے
سو بار لُٹے اور بھر پایا

اب کیوں اُس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف و خطر سے درگزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے

گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہوگا دیکھا جائے گا

اکتوبر ۷۵ء

موری اَرَج سنو

(نذرِ خسرو)

"موری ارج سنو دست گیر پیر"
"مائی ری، کہوں کا سے میں
اپنے جیا کی پیر"
"نیّا باندھو رے،
باندھو رے کنارِ دریا،"
"مورے مندر اب کیوں نہیں آئے"

اِس صورت سے
عرض سناتے؛
درد بتاتے

نیّا کھیتے
منّت کرتے
رستہ تکتے
کتنی صدیاں بیت گئی ہیں
اب جا کر یہ بھید کھُلا ہے
جس کو تم نے عرض گزاری
جو تھا ہاتھ پکڑنے والا
جس جا لاگی ناؤ تمھاری
جس سے دُکھ کا دارُو مانگا
تورے مندر میں جو نہیں آیا
وہ تو تمھیں تھے
وہ تو تمھیں تھے

ستمبر ۱۹۷۵ء

○
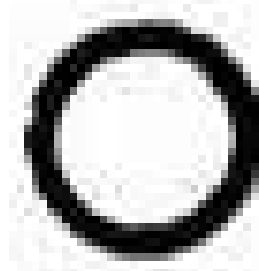
ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

مقابلِ صفِ اعدا، جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی

یہ برہمن کا کرم، وہ عطائے شیخِ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی

جو کچھ بھی بن نہ پڑا، فیض، لُٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعا و سلام ہوتی رہی

○
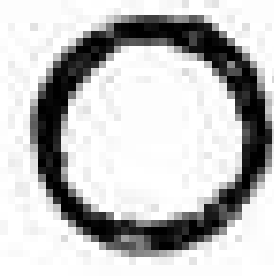
تجھے پکارا ہے بے ارادہ
جو دل دُکھا ہے بہت زیادہ
ندیم ہو تیرا حرفِ شیریں
تو رنگ پر آئے رنگِ بادہ
عطا کرو اِک ادائے دیریں
تو اشک سے تر کریں لبادہ
نہ جانے کس دن سے منتظِر ہے
دلِ سرِ رہگزر فتادہ
کہ ایک دن پھر نظر میں آئے
وہ بامِ روشن، وہ درکشادہ
وہ آئے پرسش کو پھر سجائے
قبائے رنگیں، ادائے سادہ

شامِ شہرِ یاراں

۱۷
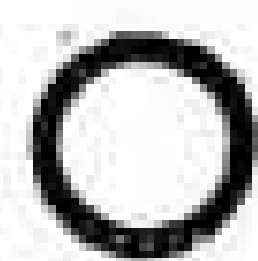
حسرتِ دید میں گزراں ہیں زمانے کب سے
دشتِ اُمّید میں گرداں ہیں دوانے کب سے

دیر سے آنکھ پہ اُترا نہیں اشکوں کا عذاب
اپنے ذمّے ہے ترا قرض نہ جانے کب سے

کس طرح پاک ہو بے آرزو لمحوں کا حساب
درد آیا نہیں دربار سجانے کب سے

سرکرو ساز کہ چھیڑیں کوئی دل سوز غزل
"ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے کب سے"

پُر کرو جام کہ شاید ہو اِسی لحظہ رواں
روک رکھا ہے جو اِک تیر قضا نے کب سے

فیضؔ پھر کب کسی مقتل میں کریں گے آباد
لب پہ ویراں ہیں شہیدوں کے فسانے کب سے

لینن گراڈ کا گورستان

سرد سِلوں پر
زرد سِلوں پر
تازہ گرم لہو کی صورت
گلدستوں کے چھینٹے ہیں
کتبے سب بے نام ہیں لیکن
ہر اک پھول پہ نام لکھا ہے
غافل سونے والے کا

یاد میں رونے والے کا

اپنے فرض سے فارغ ہو کر
اپنے لہو کی تان کے چادر
سارے بیٹے خواب میں ہیں
اپنے غموں کا ہار پرو کر
امّاں اکیلی جاگ رہی ہے

لینن گراڈ ۱۹۷۶ء

○
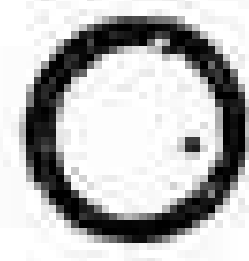
یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا

غمِ جہاں ہو، رُخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

تھے خاکِ راہ بھی ہم لوگ قہرِ طوفاں بھی
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا

خوشا کہ آج ہر اک مدّعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا

وہ حیلہ گر جو وفا جُو بھی ہے جفا خُو بھی
کیا بھی فیضؔ تو کس بُت سے دوستانہ کیا

۱۹۷۸ء

کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا،
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام اُلجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو اُدھورا چھوڑ دیا

۱۹۷۶ء

درِ اُمید کے دریوزہ گر

پھر پھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں
شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں
پھر کفِ آلودہ زبانیں مدح و ذَم کی قمچیاں
میرے ذہن و گوش کے زخموں پہ برسانے لگیں

پھر نکل آئے ہوسناکوں کے رقصاں طائفے
دردمندِ عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لیے
پھر دُہل کرنے لگے تشہیرِ اخلاص و وفا
کشتۂ صدق و صفا کا دل جلانے کے لیے

ہم کہ ہیں کب سے درِ اُمّید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دستِ طلب پھیلائیں گے

کوچہ و بازار سے پھر چُن کے ریزہ ریزہ خواب
ہم یونہی پہلے کی صورت جوڑنے لگ جائیں گے

مارچ ۱۹۷۷ء

آج اِک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال

(۱)

آج اِک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال
مدھ بھرا حرف کوئی، زہر بھرا حرف کوئی
دل نشیں حرف کوئی، قہر بھرا حرف کوئی
حرفِ اُلفت کوئی دلدارِ نظر ہو جیسے
جس سے ملتی ہے نظر بوسۂ لب کی صورت
اتنا روشن کہ سرِ موجۂ زر ہو جیسے
صحبتِ یار میں آغازِ طرب کی صورت
حرفِ نفرت کوئی شمشیرِ غضب ہو جیسے

تا ابد شہرِ ستم جس سے تبہ ہو جائیں
اتنا تاریک کہ شمشان کی شب ہو جیسے
لب پہ لاؤں تو مرے ہونٹ سیہ ہو جائیں

(۲)

آج ہر سُر سے ہر اک راگ کا ناتا ٹوٹا
ڈھونڈتی پھرتی ہے مطرب کو پھر اُس کی آواز
جوششِ درد سے مجنوں کے گریباں کی طرح
چاک در چاک ہُوا آج ہر اک پردۂ ساز
آج ہر موجِ ہوا سے ہے سوالی خلقت
لا کوئی نغمہ، کوئی صَوت، تری عمر دراز
نوحۂ غم ہی سہی، شورِ شہادت ہی سہی،
صُورِ محشر ہی سہی، بانگِ قیامت ہی سہی

جولائی ۱۹۷۷ء

○
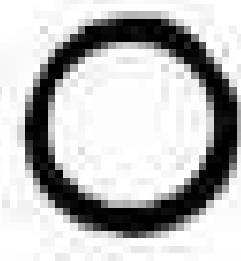
کس شہر نہ شُہرہ ہُوا نادانیٔ دل کا
کس پر نہ کُھلا رازِ پریشانیٔ دل کا

آؤ کریں محفل پہ زرِ زخم نمایاں
چرچا ہے بہت بے سروسامانیٔ دل کا

دیکھ آئیں چلو کوئے نگاراں کا خرابہ
شاید کوئی محرم ملے ویرانیٔ دل کا

پوچھو تو اِدھر تیر فگن کون ہے یارو
سونپا تھا جسے کام نگہبانیٔ دل کا

دیکھو تو کدھر آج رُخِ بادِ صبا ہے
کس رہ سے پیام آیا ہے زندانیٔ دل کا

اُترے تھے کبھی فیضؔ وہ آئینۂ دل میں
عالم ہے وہی آج بھی حیرانیٔ دل کا

اشعار

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اُٹھے تھے ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دعا گیا

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا، تو وہ قدرِ رسمِ وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدّعی، تو ثوابِ صدق و صفا گیا

فرمایشیں

مرثیۂ امام

رات آئی ہے شبّیر پہ یلغارِ بلا ہے
ساتھی نہ کوئی یار نہ غمخوار رہا ہے
مونِس ہے تو اِک درد کی گھنگھور گھٹا ہے
مُشفِق ہے تو اِک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے
تنہائی کی، غربت کی، پریشانی کی شب ہے
یہ خانۂ شبّیر کی ویرانی کی شب ہے

دشمن کی سپہ خواب میں مدہوش پڑی تھی
پل بھر کو کسی کی نہ اِدھر آنکھ لگی تھی
ہر ایک گھڑی آج قیامت کی گھڑی تھی
یہ رات بہت آلِ محمدؐ پہ کڑی تھی
رہ رہ کے بکا اہلِ حرم کرتے تھے ایسے
تھم تھم کے دیا آخرِ شب جلتا ہے جیسے

اِک گوشے میں اُن سوختہ سامانوں کے سالار
اِن خاک بسر، خانماں ویرانوں کے سردار
تشنہ لب و درماندہ و مجبور و دل افگار
اِس شان سے بیٹھے تھے شہِ لشکرِ احرار
مسند تھی، نہ خلعت تھی، نہ خدّام کھڑے تھے
ہاں تن پہ جدھر دیکھیے سو زخم سجے تھے

کچھ خوف تھا چہرے پہ نہ تشویش ذرا تھی
ہر ایک ادا مظہرِ تسلیم و رضا تھی
ہر ایک نگہ شاہدِ اقرارِ وفا تھی
ہر جنبشِ لب منکرِ دستورِ جفا تھی
پہلے تو بہت پیار سے ہر فرد کو دیکھا
پھر نام خدا کا لیا اور یوں ہُوئے گویا

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل
الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہوئی نازل
بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل
وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل
بازی ہُوئی انجام، مبارک ہو عزیزو
باطل ہُوا ناکام، مبارک ہو عزیزو

پھر صبح کی لَو آئی رُخِ پاک پہ چمکی
اور ایک کرن مقتلِ خوں ناک پہ چمکی
نیزے کی اَنی تھی خس و خاشاک پہ چمکی
شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی
دم بھر کے لیے آئینہ رُو ہو گیا صحرا
خورشید جو اُبھرا تو لہُو ہو گیا صحرا

پر باندھے ہُوئے حملے کو آئی صفِ اعدا
تھا سامنے اِک بندۂ حق یکّہ و تنہا
ہر چند کہ ہر اک تھا اُدھر خون کا پیاسا
یہ رُعب کا عالم کہ کوئی پہل نہ کرتا
کی آنے میں تاخیر جو لیلائے قضا نے
خطبہ کیا ارشاد امامِ شہدا نے

فرمایا کہ کیوں درپئے آزار ہو لوگو
حق والوں سے کیوں برسرِ پیکار ہو لوگو
واللہ کہ مجرم ہو، گنہگار ہو لوگو
معلوم ہے کچھ کس کے طرفدار ہو لوگو
کیوں آپ کے آقاؤں میں اور ہم میں ٹھنی ہے
معلوم ہے کس واسطے اس جاں پہ بنی ہے

سَطوت نہ حکومت نہ حشم چاہیے ہم کو
اورنگ نہ افسر، نہ عَلم چاہیے ہم کو
زر چاہیے، نے مال و دِرَم چاہیے ہم کو
جو چیز بھی فانی ہے وہ کم چاہیے ہم کو
سرداری کی خواہش ہے نہ شاہی کی ہوس ہے
اِک حرفِ یقیں، دولتِ ایماں ہمیں بس ہے

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلب گار
باطل کے مقابل میں صداقت کے پرستار
انصاف کے، نیکی کے، مروّت کے طرفدار
ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار
جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے،
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے،

تا حشر زمانہ تمھیں مکّار کہے گا
تم عہد شکن ہو، تمھیں غدّار کہے گا
جو صاحبِ دل ہے، ہمیں ابرار کہے گا
جو بندۂ حُر ہے، ہمیں احرار کہے گا
نام اُونچا زمانے میں ہر انداز رہے گا
نیزے پہ بھی سر اپنا سرافراز رہے گا

کر ختم سخن محوِ دعا ہو گئے شبّیر
پھر نعرہ زناں محوِ وغا ہو گئے شبّیر
قربانِ رہِ صدق و صفا ہو گئے شبّیر
خیموں میں تھا کہرام، جُدا ہو گئے شبّیر
مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اِس خاک تلے جنّتِ فردوس کا در تھا

۱۹۶۴ء

مدح

حسین شہید سہروردی مرحوم نے راولپنڈی "سازش" کیس ملزموں کی جانب سے وکالت کی تھی۔ مقدمے کے خاتمے پر انھیں یہ سپاسنامہ پیش کیا گیا۔

کس طرح بیاں ہو ترا پیرایۂ تقریر
گویا سرِ باطل پہ چمکنے لگی شمشیر
وہ زور ہے اِک لفظ اِدھر نُطق سے نکلا
واں سینۂ اغیار میں پیوست ہُوے تیر
گرمی بھی ہے ٹھنڈک بھی، روانی بھی سکوں بھی
تاثیر کا کیا کہیے، ہے تاثیر سی تاثیر
اعجاز اسی کا ہے کہ اربابِ ستم کی
اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر

اطرافِ وطن میں ہُوا حق بات کا شُہرہ
ہر ایک جگہ مکر و ریا کی ہُوئی تشہیر
روشن ہُوئے اُمّید سے رُخ اہلِ وفا کے
پیشانیٔ اعداء پہ سیاہی ہُوئی تحریر

(۳)

حرّیتِ آدم کی رہِ سخت کے رہگیر
خاطر میں نہیں لاتے خیالِ دمِ تعزیر
کچھ ننگ نہیں رنجِ اسیری کہ پرُانا
مردانِ صفا کیش سے ہے رشتۂ زنجیر
کب دبدبۂ جبر سے دبتے ہیں کہ جن کے
ایمان و یقیں دل میں کیے رہتے ہیں تنویر
معلوم ہے ان کو کہ رہا ہو گی کسی دن
ظالم کے گراں ہاتھ سے مظلوم کی تقدیر

آخر کو سرافراز ہُوا کرتے ہیں احرار
آخر کو گرا کرتی ہے ہر جَور کی تعمیر
ہر دَور میں سر ہوتے ہیں قصرِ جم و دارا
ہر عہد میں دیوارِ ستم ہوتی ہے تسخیر
ہر دَور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانیٔ شبّیر

(۳)

کرتا ہے قلم اپنے لب و نطق کی تطہیر
پہنچی ہے سرِ حرفِ دعا اب مری تحریر
ہر کام میں برکت ہو ہر اک قول میں قوّت
ہر گام پہ ہو منزلِ مقصود قدم گیر
ہر لحظہ ترا طالعِ اقبال سوا ہو
ہر لحظہ مدد گار ہو تدبیر کی تقدیر

ہر بات ہو مقبول، ہر اک بول ہو بالا
کچھ اور بھی رونق میں بڑھے شعلۂ تقریر
ہر دن ہو ترا لطفِ زباں اور زیادہ
اللہ کرے زورِ بیاں اور زیادہ

گیت

منزلیں، منزلیں،
شوقِ دیدار کی منزلیں،
حُسنِ دلدار کی منزلیں، پیار کی منزلیں،
پیار کی بے پنہ رات کی منزلیں،
کہکشانوں کی بارات کی منزلیں،
سربلندی کی، ہمّت کی، پرواز کی
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں

زندگی کی کٹھن راہ کی منزلیں
سربلندی کی ہمّت کی، پرواز کی منزلیں
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں،
آن ملنے کے دن
پھول کھلنے کے دن
وقت کے گھور ساگر میں صبح کی
شام کی منزلیں،
چاہ کی منزلیں
آس کی، پیاس کی،
حسرتِ یار کی
پیار کی منزلیں،
منزلیں حسنِ عالم کے گلزار کی
منزلیں، منزلیں

موج در موج ڈھلتی ہوئی رات کے درد کی منزلیں
چاند تاروں کے ویران سنسار کی منزلیں،
اپنی دھرتی کے آباد بازار کی منزلیں
حق کے عرفان کی
نورِ انوار کی منزلیں،
وصلِ دلدار کی منزلیں
قول واقرار کی منزلیں،
منزلیں، منزلیں

(فلم "قسم اُس وقت کی")

گیت

اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات
تھم گئے آنسو
تھک گئیں اکھیاں
گزر گئی برسات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات

کب سے آس لگی درشن کی
کوئی نہ جانے بات
کوئی نہ جانے بات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات
تم آؤ تو من میں اُترے
پھولوں کی بارات
بیت چلی ہے رات
اب کیا دیکھیں راہ تمھاری
بیت چلی ہے رات

(فلم "جاگو ہوا سویرا")

گیت

ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر
سب چاہتیں بھلا کر
کتنے اداس آئے
ہم تیرے پاس جا کر
کیا کیا نہ دل دکھا ہے
کیا کیا بہی ہیں اکھیاں

کیا کیا نہ ہم پہ بیتی
کیا کیا ہُوے پریشاں
ہم تجھ سے دل لگا کر
تجھ سے نظر ملا کر
کتنے فریب کھائے
اپنا تجھے بنا کر

ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر
تھی آس آج ہم پہ کچھ ہو گی مہربانی
ہلکا کریں گے جی کو سب حالِ دل زبانی
تجھ کو سُنا سُنا کر
آنسو بہا بہا کر

کتنے اُداس آئے
ہم تیرے پاس جا کر
ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر

(فلم "سُکھ کا سپنا")

اُمیدِ سحر کی بات سنو

جگر دریدہ ہوں چاکِ جگر کی بات سنو
الم رسیدہ ہوں دامانِ تر کی بات سنو
زباں بُریدہ ہوں زخمِ گلو سے حرف کرو
شکستہ پا ہوں ملالِ سفر کی بات سنو
مسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سنو
سحر کی بات، امیدِ سحر کی بات سنو

○
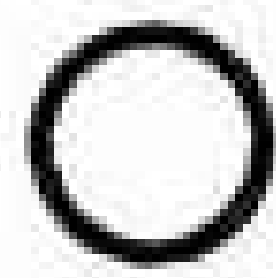
حیراں ہے جبیں آج کِدھر سجدہ روا ہے
سر پر ہیں خداوند سرِ عرش خدا ہے

کب تک اسے سینچو گے تمنّائے ثمر ہیں
یہ صبر کا پودا تو نہ پھُولا نہ پھلا ہے

مِلتا ہے خراج اس کو تری نانِ جویں سے
ہر بادشہِ وقت ترے در کا گدا ہے

ہر ایک عقوبت سے ہے تلخی میں سواتر
وہ رنج جو ناکردہ گناہوں کی سزا ہے

احسان لیے کتنے مسیحا نفسوں کے
کیا کیجیے دل کا، نہ جلا ہے نہ بجُھا ہے

اکتوبر ۷۰ء

پنجابی نظماں

لمّی رات سی درد فراق والی
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
کوڑا گھُٹ کیتی مٹھڑے یار میرے
مٹھڑے یار میرے، جانی یار میرے
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
جھانجراں وانگ، زنجیراں چھنکائیاں نیں،
کدی کنّیں مندراں پائیاں نیں،
کدی پیریں بیڑیاں چائیاں نیں،
تیری تاہنگ وِچ پٹ دا ماس دے کے
اساں کاگ سدّے، اساں سینہہ گھلّے
رات مُکدی اے، یار آوندا اے
اسیں تک دے رہے ہزار وَلّے
کوئی آیا نہ بِناں خُنامیاں دے
کوئی پُجّا نہ سوا اُلاہمیاں دے

اَج لاہ اُلاہمے مٹھڑے یار میرے

اَج آ ویہڑے وِچھڑے یار میرے

فجر ہووے تے آکھیے بسم اللہ

اَج دولتاں ساڈے گھر آئیاں نیں

جیہدے قول تے اساں وساہ کیتا

اوہنے اوڑک توڑ نبھائیاں نیں

۱۹۷۱ء

گیت

کدھرے نہ پیندیاں دسّاں
وے پردیسیا تیریاں
کاگ اُڈاواں، شگن مناداں
وگدی وا دے ترلے پاداں
تری یاد پوے تے روواں
ترا ذکر کراں تاں ہسّاں
کدھرے نہ پیندیاں دسّاں
وے پردیسیا تیریاں

درد نہ دسّاں گھُلدی جاداں
راز نہ کھولاں مُکدی جاداں

کس نوں دل دے داغ وِکھاواں
کس در اَگے جھولی ڈھاواں
وے میں کس دا دامن کھتساں
کِدھرے نہ پیندیاں دسّاں
وے پردیسیا تیریاں

شام اُڈیکاں، فجر اُڈیکاں،
آکھیں تے ساری عمر اُڈیکاں؛
آنڈ گواںڈی دیوے بلدے
ربّا ساڈا چانن گھلدے
جگ وسدا اے میں وی وسّاں
کِدھرے نہ پیندیاں دسّاں
کِدھرے نہ پیندیاں دسّاں
وے پردیسیا تیریاں

۱۹۷۱ء

میری ڈولی شوہ دریا

(سنہ ۷۳ء کے سیلاب زدوں کے امدادی فنڈ کے لیے لکھی گئی)

کل تائیں سانوں بابلا
تو رکھیا ہِک نال لا
ست خیراں ساڈیاں منگیاں
جد جُھلّی تتّی وا
اَج کیکن ویہڑیوں ٹوریا
کوئیں لاہے نی میرے چاء
میرے گہنے نیل ہتھ پیر دے
میری ڈولی شوہ دریا
اَج لتھّے سارے چاء
میری ڈولی شوہ دریا،

ناں رُہڑ دیاں رُڑھ گیاں سدھراں

ناں روندیاں رُل گئے نیر

ناں ہُونج ہُونج کے لَے گئے

میرے ہتھ دی لیکھ لکیر

میری چُنّی بُک سواہ دی

میرا چولا لیر و لیر

لج پالن تو ہڑے بھین دی

کوئی کرماں والے ویر

میرے کرماں والے ویر

میرا چولا لیر و لیر

میرے لتّھے سارے چار

میری ڈولی شوہ دریا

نسّتی مرکے جنّتن ہو گئی

میں ترکے اَوتر حال

سُن ہاڑے اِس مسکین دے

ربّا پورا کر سوال

میری جھوک وَسّے، میرا دیر وَسّے

فیر تیری رحمت نال

کوئی پُورا کرے سوال ربّا

تیری رحمت نال،

میرے لئی سارے چار

میری ڈِدلی شوہ دریا،

۱۹۷۳ء

ربّا سچّیا

ربّا سچّیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں،
ساڈا نَیب تے عالیجاہ ہیں توں،
ایس لارے تے ٹور کد پُچھیا ای
کیہہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار دی لئی اُو ربّ سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کیہہ کیتیاں نیں

کتنے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتنے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈاں وچ کلپے جان میری
جیویں پھاہی وچ کونج کرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا اِی رب سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

مینوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے
میں تے عزت دا ٹکر منگناں ہاں
مینوں تاہنگ نئیں محلاں ماڑیاں دی
میں تے جیویں دی نکر منگناں ہاں

میری مَنّیں تے تیریاں مَیں منّاں
تیری سَوہنہ جے اِک وی گلّ موڑاں
جے ایہہ مانگ نئیں پُجدی تئیں ربّا
فیر میں جاواں تے ربّ کوئی ہور لوڑاں

۱۹۷۸ء

قطعہ

آج رات اِک رات دی رات جی کے
اساں جُگ ہزاراں جی لِتّا اے
آج رات امرت دے جام وانگوں
اینہاں ہتھّاں نے یار نوں پی لتا اے

میری منّتیں تے تیریاں بسّ منّاں
تیری سَو سونہہ جے اِک وی گلّ موڑاں
جے ایہہ مانگ نئیں پُجدی نہیں ربّا
فیر میں جاواں تے ربّ کوئی ہور لوڑاں

۱۹۷۴ء

تراجِم

ناظم حکمت

زنداں سے ایک خط

مری جاں تجھ کو بتلاؤں، بہت نازک یہ نکتہ ہے
بدل جاتا ہے انساں جب مکاں اس کا بدلتا ہے !
مجھے زنداں میں پیار آنے لگا ہے اپنے خوابوں پر
جو شب کو نیند اپنے مہرباں ہاتھوں سے
وا کرتی ہے در اس کا
تو آگرتی ہے ہر دیوار اس کی میرے قدموں پر
میں ایسے غرق ہو جاتا ہوں اس دم اپنے خوابوں میں
کہ جیسے اِک کرن ٹھہرے ہوئے پانی پہ گرتی ہے

---

* ترکی کا شہرۂ آفاق شاعر جس نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکی کی جنگِ حریت میں حصّہ لیا اور بعد میں بیشتر عمر قید و بند اور جلاوطنی میں گزاری۔ ۱۹۶۳ء میں وفات پائی۔

میں ان لمحوں میں کتنا سرخوش و دلشاد پھرتا ہوں
جہاں کی جگمگاتی وسعتوں میں کس قدر آزاد پھرتا ہوں
جہاں درد و الم کا نام ہے کوئی نہ زنداں ہے
"تو پھر بیدار ہونا کس قدر تم پر گراں ہوگا؟"
نہیں ایسا نہیں ہے۔ میری جاں! میرا یہ قصّہ ہے
میں اپنے عزم و ہمت سے
وہی کچھ بخشتا ہوں نیند کو جو اس کا حصّہ ہے

ویرا کے نام

اُس نے کہا آؤ،
اُس نے کہا ٹھہرو،
مسکاؤ کہا اس نے
مر جاؤ کہا اس نے
میں آیا،
میں ٹھہر گیا،
مسکایا
اور مر بھی گیا

---

* ناظم حکمت کی رُوسی بیوی

اے میرے وطن

او میرے وطن ! او میرے وطن ! او میرے وطن !

مرے سر پر وہ ٹوپی نہ رہی

جو تیرے دیس سے لایا تھا

پاؤں میں وہ اب جوتے بھی نہیں

واقف تھے جو تیری راہوں سے

مرا آخری کُرتا چاک ہُوا

ترے شہر میں جو سِلوایا تھا

اب تیری جھلک

اوبجز*، عمر علی سلیمان

صحرا کی رات

کہیں بھی شبنم کہیں نہیں ہے
عجب، کہ شبنم کہیں نہیں ہے
نہ سردِ خورشید کی جبیں پر
کسی کے رُخ پر، نہ آستیں پر
ذرا سی شبنم کہیں نہیں ہے
پسے ہوئے پتّھروں کی موجیں
خموش وساکن
حرارتِ ماہِ نیم شب میں سُلگ رہی ہیں
اور شبنم کہیں نہیں ہے
برہنہ پا غول گیدڑوں کے
لگا رہے ہیں بنوں میں ٹھٹّے

* قازقستان کا ممتاز نوجوان شاعر

کہ آج شبنم کہیں نہیں ہے
ببول کے استخواں کے ڈھانچے
پکارتے ہیں،
نہیں ہے شبنم، کہیں نہیں ہے
سفید، دھندلائی روشنی میں
ہیں دشت کی چھاتیاں برہنہ
ترس رہی ہیں جو بنِ انساں لیے کہ شبنم کا ایک قطرہ
کہیں پہ برسے
یہ چاند بھی سرد ہو رہے گا
اُفق پہ جب صبح کا کنارا
کسی کرن سے دہک اُٹھے گا
کہ ایک درماندہ راہرو کی
جبیں پہ شبنم کا ہاتھ چمکے

——— انتہا ———

میرے دل میرے مسافر

اِنتساب

یاسر عرفات

مع الاحترامات

ناصحم گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق

بروای خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں

حافظ

ترتیب

دلِ من مسافرِ من

مرے دل، مرے مسافر
ہُوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر رہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر، کا
کہ سُراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا

۸

ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا!

لندن ۱۹۷۸ء

پھول مُرجھا گئے سارے

پھول مرجھا گئے ہیں سارے
تھمتے نہیں ہیں آسماں کے آنسو
شمعیں بے نور ہو گئی ہیں
آئینے چُور ہو گئے ہیں
ساز سب بج کے کھو گئے ہیں
پایلیں بجھ گئے سو گئی ہیں
اور ان بادلوں کے پیچھے
دُور اِس رات کا دُلارا

۱۰

درد کا ستارا

ٹمٹما رہا ہے

جھنجھنا رہا ہے

مسکرا رہا ہے

لندن ۷۸ء

۱۱

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے!

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو
عمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو
جیسے بیگانہ سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو

مرے دل مرے مسافر

۱۲

گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد
اپنا احساسِ زیاں اور زیادہ ہوگا
ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
اَن کہی بات کا موہوم سا پردہ ہوگا
کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہوگا

گردِ ایّام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سُنو، اور جو نہ چاہو نہ سُنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو، اور جو نہ چاہو نہ کہو

لندن ۱۹۷۸ء

دو غزلیں

مخدوم کی یاد میں

(۱)

"آپ کی یاد آتی رہی رات بھر"
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر

گاہ جلتی ہوئی، گاہ بجھتی ہوئی
شمعِ غم جھلملاتی رہی رات بھر

کوئی خوشبو بدلتی رہی پیرہن
کوئی تصویر گاتی رہی رات بھر

۱۴

پھر صبا سایۂ شاخِ گُل کے تلے
کوئی قِصّہ سناتی رہی رات بھر

جو نہ آیا اُسے کوئی زنجیرِ در
ہر صدا پر بُلاتی رہی رات بھر

ایک اُمّید سے دل بہلتا رہا
اِک تمنّا ستاتی رہی رات بھر

ماسکو ستمبر ۷۸ء

(۲)

"اُسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب"

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھُلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب

صبح پھُوٹی تو وہ پہلو سے اُٹھا آخرِ شب
وہ جو اِک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب

چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب

۱۶

لمسِ جانانہ لیے، مستیٔ پیمانہ لیے
حمدِ باری کو اُٹھے دستِ دعا آخرِ شب

گھر جو ویراں تھا سرِ شام وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب

جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اوّلِ صبح
اُسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب"

ماسکو اکتوبر ۱۹۷۸ء

۱۷

ایک دکنی غزل

کچھ پہلے اِن آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارا گزرے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا

تھے کتنے اچھے لوگ کہ جن کو اپنے غم سے فرصت تھی
سب پوچھیں تھے احوال جو کوئی درد کا مارا گزرے تھا

اب کے تو خزاں ایسی ٹھہری وہ سارے زمانے بھول گئے
جب موسمِ گُل ہر پھیرے میں آ آ کے دوبارا گزرے تھا

اے دل مرے مسافر

۱۸

تھی یاروں کی بہتات تو ہم اغیار سے بھی بیزار نہ تھے
جب مل بیٹھے تو دشمن کا بھی ساتھ گوارا گزرے تھا

اب تو ہاتھ سجھائی نہ دیوے، لیکن اب سے پہلے تو
آنکھ اُٹھتے ہی ایک نظر میں عالم سارا گزرے تھا

ماسکو
اکتوبر ۷۸ء

منظر

آسماں آج اِک بحرِ پُر شور ہے
جس میں ہر سُو رواں بادلوں کے جہاز
ان کے عرشے پہ کرنوں کے مستول ہیں
بادبانوں کی پہنے ہُوئے فرغلیں
نیل میں گنبدوں کے جزیرے کئی
ایک بازی میں مصروف ہے ہر کوئی

مرے دل مرے مسافر
۲۰

ابابیل کوئی نہاتی ہوئی

کوئی چیل غوطے میں جاتی ہوئی

کوئی طاقت نہیں اس میں زور آزما

کوئی بیڑا نہیں ہے کسی ملک کا

اِس کی تہ میں کوئی آبدوزیں نہیں

کوئی راکٹ نہیں، کوئی توپیں نہیں

یوں تو سارے عناصر ہیں یاں زور میں

امن کتنا ہے اِس بحرِ پُرشور میں

سمرقند، مارچ ۷۸ء

دو نظمیں

قفقاز کے شاعر قاسن قلی سے ماخوذ

(۱)

شاعر لوگ

ہر اک دَور میں ہم، ہر زمانے میں ہم
زہر پیتے رہے، گیت گاتے رہے
جان دیتے رہے زندگی کے لیے
ساعتِ وصل کی سرخوشی کے لیے

مرے دل مرے مسافر
۲۲

دین و دنیا کی دولت لٹاتے رہے
فقر و فاقہ کا توشہ سنبھالے ہوئے
جو بھی رستہ چُنا اس پہ چلتے رہے
مال والے حقارت سے تکتے رہے
طعن کرتے رہے، ہاتھ ملتے رہے
ہم نے ان پر کیا حرفِ حق سنگ زن
جن کی ہیبت سے دنیا لرزتی رہی
جن پہ آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا
اپنی آنکھ اُن کے غم میں برستی رہی
سب سے اوجھل ہُوئے حکمِ حاکم پہ ہم
قید خانے سہے، تازیانے سہے
لوگ سنتے رہے سازِ دل کی صدا
اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے

۲۳

خونچکاں دہر کا خونچکاں آئینہ
دکھ بھری خلق کا دکھ بھرا دل ہیں ہم
طبعِ شاعر ہے جنگاہِ عدل و ستم
مُنصفِ خیر و شر، حق و باطل ہیں ہم

(۲)

شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

چھلنی ہے اندھیرے کا سینہ، برکھا کے بھالے برسے ہیں
دیواروں کے آنسو ہیں رواں، گھر خاموشی میں ڈوبے ہیں
پانی میں نہائے ہیں بوٗٹے
گلیوں میں ہوٗ کا پھیرا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

٭ شوپیں CHOPIN پولینڈ کا ممتاز نغمہ ساز

۲۵

غمگیں لڑکی کے چہرے پر چاند کی زردی چھائی ہے
برف گری تھی اِس پہ لہو کے چھینٹوں کی رُشنائی ہے
وں کا ہر داغ دمکتا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

آزادی کے متوالے، جاں کف پہ لیے میداں میں گئے
ہر سُو دشمن کا نرغہ تھا، کچھ بچ نکلے، کچھ کھیت رہے
عالم میں ان کا شہرہ ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

اک کونج کو سکھیاں چھوڑ گئیں آکاش کی نیلی راہوں میں
وہ یاد میں تنہا روتی تھی، لپٹائے اپنی باہوں میں
اِک شاہیں اس پر جھپٹا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

۲۵

اک غمگیں لڑکی کے چہرے پر چاند کی زردی چھائی ہے
جو برف گری تھی اِس پہ لہو کے چھینٹوں کی رُشنائی ہے
خوں کا ہر داغ دمکتا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

کچھ آزادی کے متوالے، جاں کف پہ لیے میداں میں گئے
ہر سُو دشمن کا نرغہ تھا، کچھ بچ نکلے، کچھ کھیت رہے
عالم میں ان کا شہرہ ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

اک کُونج کو سکھیاں چھوڑ گئیں آکاش کی نیلی راہوں میں
وہ یاد میں تنہا روتی تھی، لپٹائے اپنی باہوں میں
اِک شاہیں اس پر جھپٹا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

مرے دل مرے مسافر

۲۶

غم نے سانچے میں ڈھالا ہے
اِک باپ کے پتھر چہرے کو
مردہ بیٹے کے ماتھے کو
اِک ماں نے رو کر چُوما ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

پھر پھُولوں کی رُت لَوٹ آئی
اور چاہنے والوں کی گردن میں جھُولے ڈالے باہوں نے
پھر جھرنے ناچے چھن چھن چھن
اب بادل ہے نہ برکھا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

ماسکو ۹ ۷ ۶

۲۷

لاؤ تو قتل نامہ مرا

سُننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہُوئی

رِندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی

آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سُو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہُوئی

آخر کو آج اپنے لہو پر ہُوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہُوئی

"لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہُوئی"

۲۸

○
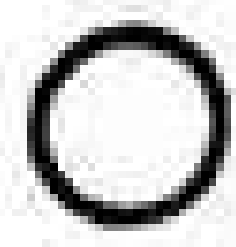
سہل یوں راہِ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے

ہم نے دل میں سجا لیے گلشن
جب بہاروں نے بے رُخی کی ہے

زہر سے دھو لیے ہیں ہونٹ اپنے
لطفِ ساقی نے جب کمی کی ہے

تیرے کوچے میں بادشاہی کی
جب سے نکلے گداگری کی ہے

مرے دل مرے مسافر

۲۹

بس وہی سرخ رُو ہُوا جس نے
بحرِ خوں میں شناوری کی ہے

"جو گزرتے تھے داغ پر صدمے"
اب وہی کیفیت سبھی کی ہے

لندن ۷۹ء

تین آوازیں

ظالم

جشن ہے ماتمِ اُمید کا آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے
تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے میں نے
جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو
بسترِ خواب سے کیا چاہتے ہو

ساری آنکھوں کو تہِ تیغ کیا ہے میں نے
سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے
اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا
فصلِ گُل آئے گی نمرود کے انگار لیے
اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا
ابر آئے گا خس و خار کے انبار لیے
میرا مسلک بھی نیا راہِ طریقت بھی نئی
میرے قانوں بھی نئے میری شریعت بھی نئی
اب فقیہانِ حرم دستِ صنم چومیں گے
سرو قد مٹی کے بونوں کے قدم چومیں گے
فرش پر آج درِ صدق و صفا بند ہُوا
عرش پر آج ہر اک بابِ دعا بند ہُوا

مظلوم

رات چھائی تو ہر اک درد کے دھارے چھوٹے
صبح پھوٹی تو ہر اک زخم کے ٹانکے ٹوٹے
دوپہر آئی تو ہر رگ نے لہو برسایا
دِن ڈھلا، خوف کا عفریت مقابل آیا
یا خدا یہ مری گردانِ شب و روز و سحر
یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر
کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تو نے
ہر مسرّت سے مجھے عاق کیا ہے تو نے
وہ یہ کہتے ہیں تو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے
وہ یہ کہتے ہیں ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟
ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟

ندائے غیب

ہر اک اُولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

سمرقند۔ مئی ۷۹ء

یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا
وہ جا لگی ہے افق کنارے
اُداس رنگوں کی چاندنیا
اُتر گئے ساحلِ زمیں پر
سبھی کھویّا
تمام تارے

۳۵

اکھڑ گئی سانس پتّیوں کی

چلی گئیں اُونگھ میں ہوائیں

گجر بجا حکمِ خامُشی کا

تو چپ میں گم ہو گئیں صدائیں

سحر کی گوری کی چھاتیوں سے

ڈھلک گئی تیرگی کی چادر

اور اس بجائے

بکھر گئے اس کے تن بدن پر

نراس تنہائیوں کے سائے

اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

کہ دن ڈھلے شہر سے نکل کر

کدھر کو جانے کا رُخ کیا تھا

نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل

کسی مسافر کو

اب دماغِ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

یہ وقت آئے تو بے ارادہ
کبھی کبھی میں بھی دیکھتا ہوں
اُتار کر ذات کا لبادہ
کہیں سیاہی ملامتوں کی
کہیں پہ گُل بُوٹے اُلفتوں کے
کہیں لکیریں ہیں آنسوؤں کی
کہیں پہ خونِ جگر کے دھبّے
یہ چاک ہے پنجۂ عدو کا

۳۷

یہ مُہر ہے یارِ مہرباں کی
یہ لعل لب ہائے مہوشاں کے
یہ مرحمت شیخِ بدزباں کی

یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہنِ دریدہ
عزیز بھی، ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ اصرارِ حرفِ اُلفت
کہ چُوم کر پھر گلے لگا لو

تاشقند ۶۷۹

ہم تو مجبورِ وفا ہیں

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہو گا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

تیرے ایوانوں میں پرزے ہوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودۂ اقرار ہوئے
کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی
خواب کتنے تری شہ راہوں میں سنگسار ہوئے

بلا کشانِ محبت پہ جو ہُوا سو ہُوا
جو مجھ پہ گزری مت اس سے کہو، ہُوا سو ہُوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
لہو کے داغ تو دامن سے دھو، ہُوا سو ہُوا

ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشّاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا ہے

۳۰

○
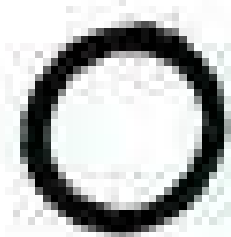
سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہُوا، سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں کبھی فرقتیں، کبھی دُوریاں کبھی قربتیں

یہ سخن جو ہم نے رقم کیے، یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا کئی شامِ ہجر کی مدّتیں

جو تمھاری مان لیں ناصحا، تو رہے گا دامنِ دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں، نہ کسی صنم کی مروّتیں

۱۴

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتلِ شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں

مری جان، آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر، کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

بیروت ۷۹

۰
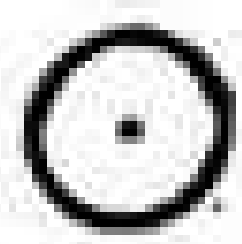
مقتل میں نہ مسجد نہ خرابات میں کوئی
ہم کس کی امانت میں غمِ کارِ جہاں دیں
شاید کوئی ان میں سے کفن پھاڑ کے نکلے
اب جائیں شہیدوں کے مزاروں پہ اذاں دیں

بیروت ۷۹ء

پیرس

دن ڈھلا، کوچہ و بازار میں صف بستہ ہُوئیں
زرد رُو روشنیاں
ان میں ہر ایک کے کشکول سے برسیں رِم جھِم
اِس بھرے شہر کی ناسودگیاں
دُور پسِ منظرِ افلاک میں دُھندلانے لگے
عظمتِ رفتہ کے نشاں

پیش منظر میں
کسی سایۂ دیوار سے لپٹا ہُوا سایہ کوئی

۴۴

دوسرے سائے کی موہوم سی امّید لیے
روزمرّہ کی طرح
زیرِلب
شرحِ بے دردیٔ ایام کی تمہید لیے
اور کوئی اجنبی
ان روشنیوں سایوں سے کتراتا ہُوا
اپنے بے خواب شبستاں کی طرف جاتا ہُوا

پیرس اگست ۷۹ء

قوالی

جلا پھر صبر کا خرمن، پھر آہوں کا دھواں اُٹھا
ہُوا پھر نذرِ صرصر ہر نشیمن کا ہر اک تنکا
ہُوئی پھر صبحِ ماتم آنسوؤں سے بھر گئے دریا
چلا پھر سُوئے گردوں کاروانِ نالۂ شبہا
ہر اک جانب فضا میں پھر مچا کہرام یارب ہا

۴۶

اُمڈ آئی کہیں سے پھر گھٹا وحشی زمانوں کی
فضا میں بجلیاں لہرائیں پھر سے تازیانوں کی
قلم ہونے لگی گردن قلم کے پاسبانوں کی
کُھلا نیلام ذہنوں کا، لگی بولی زبانوں کی
لہو دینے لگا ہر اک دہن میں بخیۂ لبہا
چلا پھر سُوئے گردوں کاروانِ نالۂ شبہا

ستم کی آگ کا ایندھن بنے دل پھر سے واویلا
یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں خداوندا
بنا پھرتا ہے ہر اک مدّعی پیغام بر تیرا
ہر اک بُت کو صنم خانے میں دعوٰی ہے خدائی کا
خدا محفوظ رکھے از خداوندانِ مذہب ہا
چلا پھر سُوئے گردوں کاروانِ نالۂ شب ہا

بیروت ۷۹ء

کیا کریں

مری تری نگاہ میں
جو لاکھ انتظار ہیں
جو میرے تیرے تن بدن میں
لاکھ دل فگار ہیں
جو میری تیری اُنگلیوں کی بے حسی سے
سب قلم نزار ہیں

جو میرے تیرے شہر کی
ہر اک گلی میں
میرے تیرے نقشِ پا کے بے نشاں مزار ہیں
جو میری تیری رات کے
ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کے
گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا
یہ چاک سارے بے رفو
کسی پہ راکھ چاند کی
کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں، بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوتِ وہم کا بُنا ہُوا

جو ہے تو اُس کا کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا، بتا،
بتا، بتا،

بیروت ۸۰ء

دو نظمیں فلسطین کے لیے

(۱)

فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے
تیری الفت، تری یادوں کی کسک ساتھ گئی
تیرے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی

۵۱

سارے ان دیکھے رفیقوں کا جلو ساتھ رہا
کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش مرا ہاتھ رہا
دُور پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں
جس زمیں پر بھی کھُلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

بیروت ۱۹۸۰ء

(۲)

فلسطینی بچّے کیلیے لوری

مت رو بچّے

رو رو کے ابھی

تیری امّی کی آنکھ لگی ہے

مت رو بچّے

کچھ ہی پہلے

تیرے ابّا نے

اپنے غم سے رخصت لی ہے

مت رو بچے

تیرا بھائی

اپنے خواب کی تتلی پیچھے

دُور کہیں پردیس گیا ہے

مت رو بچے

تیری باجی کا

ڈولا پرائے دیس گیا ہے

مت رو بچے

تیرے آنگن میں

مردہ سُورج نہلا کے گئے ہیں

چندرما دفنا کے گئے ہیں

مت رو بچے

امّی ، ابّا ، باجی ، بھائی

چاند اور سُورج

تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رُلوائیں گے
تو مسکائے گا تو شاید
سارے اِک دن بھیس بدل کر
تُجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

بیروت ۱۹۸۰

۵۵

نذرِ حافظ

ناصحم گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق
بروائے خواجۂ عاقل ہُنرے بہتر ازیں

قندِ دہن، کچھ اس سے زیادہ
لطفِ سخن، کچھ اس سے زیادہ

فصلِ خزاں میں لطفِ بہاراں
برگِ سمن کچھ اس سے زیادہ

حالِ چمن پر تلخ نوائی
مرغِ چمن، کچھ اس سے زیادہ

۵۶

دل شکنی بھی، دلداری بھی
یادِ وطن کچھ اس سے زیادہ

شمعِ بدن، فانوسِ قبا میں
خوبیٔ تن کچھ اس سے زیادہ

عشق میں کیا ہے غم کے علاوہ
خواجۂ من کچھ اس سے زیادہ

بیروت ۸۰ء

میرے ملنے والے

وہ در کھلا میرے غمکدے کا
وہ آ گئے میرے ملنے والے
وہ آ گئی شام، اپنی راہوں میں
فرشِ افسردگی بچھانے
وہ آ گئی رات چاند تاروں کو
اپنی آزردگی سنانے
وہ صبح آئی دمکتے نشتر سے
یاد کے زخم کو منانے

۵۸

وہ دوپہر آئی، آستیں میں
چھپائے شعلوں کے تازیانے
یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دن رات واسطا ہے
پہ کون کب آیا، کب گیا ہے
نگاہ و دل کو خبر کہاں ہے
خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

بیروت ۸۰ء

گاؤں کی سڑک

یہ دیس مفلس و نادار کجکلاہوں کا
یہ دیس بے زر و دینار بادشاہوں کا
کہ جس کی خاک میں قدرت ہے کیمیائی کی
یہ نائبانِ خداوندِ ارض کا مسکن
یہ نیک پاک بزرگوں کی روح کا مدفن
جہاں پہ چاند ستاروں نے جبّہ سائی کی

نہ جانے کتنے زمانوں سے اس کا ہر رستہ
مثالِ خانۂ بے خانماں تھا در بستہ

خوشا کہ آج بفضلِ خدا وہ دن آیا
کہ دستِ غیب نے اِس گھر کی در کُشائی کی

چُنے گئے ہیں سبھی خار اس کی راہوں سے
سُنی گئی ہے بالآخر برہنہ پائی کی

بیروت ۸۰ء

○
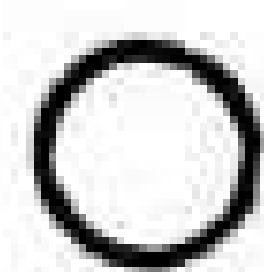
اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے، جو صید تھے اب صیّاد ہوئے

پہلے بھی خزاں میں باغ اُجڑے پر یُوں نہیں جیسے اب کے برس
سارے بُوٹے پتہ پتہ روش روش برباد ہوئے

پہلے بھی طوافِ شمعِ وفا تھی، رسم محبت والوں کی
ہم تم سے پہلے بھی یہاں منصُور ہُوئے، فرہاد ہوئے

مرے دل مرے مسافر

۶۴

اِک گُل کے مرجھانے پر کیا گلشن میں کہرام مچا
اِک چہرہ کمھلا جانے سے کتنے دل ناشاد ہوئے

فیضؔ، نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا، کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے*

---

* غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

○
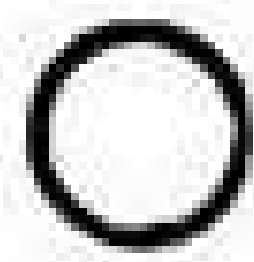
غم بہ دل، شکر بہ لب، مست و غزل خواں چلیے
جب تلک ساتھ ترے عمرِ گریزاں چلیے

رحمتِ حق سے جو اس سمت کبھی راہ ملے
سوئے جنّت بھی براہِ رہِ جاناں چلیے

نذر مانگے جو گلستاں سے خداوندِ جہاں
ساغرِ مے میں لیے خونِ بہاراں چلیے

مرے دل مرے مسافر

۶۴

جب ستانے لگے بے رنگیِ دیوارِ جہاں
نقش کرنے کوئی تصویرِ حسیناں چلیے

کچھ بھی ہو آئینۂ دل کو مصفّا رکھیے
جو بھی گزرے، مثلِ خسروِ دوراں چلیے

امتحاں جب بھی ہو منظور جگر داروں کا
محفلِ یار میں ہمراہِ رقیباں چلیے
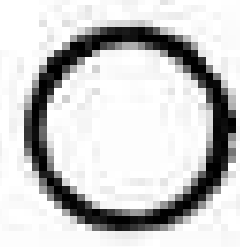
○

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اُٹھے تو ہاتھ لہو ہُوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی وہ وقارِ دستِ دعا گیا

نہ وہ رنگ فصلِ بہار کا، نہ روِش وہ ابرِ بہار کی
جس ادا سے یار تھے آشنا وہ مزاجِ بادِ صبا گیا

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا تو وہ آبروئے وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدعی تو ثوابِ صدق و صفا گیا

ابھی بادبان کو تہ رکھو ابھی مضطرب ہے رُخِ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آکے چلا گیا

○
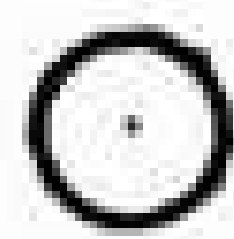
ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حسابِ خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

جہانِ دل میں کام آتی ہیں تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبضِ دوراں گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

○
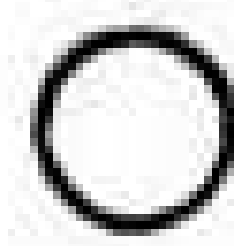
اپنے انعامِ حسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

گیت

جلنے لگیں یادوں کی چتائیں
آؤ کوئی بَیت بنائیں
جن کی رہ تکتے جگ بیتے
چاہے وہ آئیں یا نہیں آئیں
آنکھیں موند کے نِت پل دیکھیں
آنکھوں میں اُن کی پرچھائیں
اپنے دردوں کا مُکٹ پہن کر
بے دردوں کے سامنے جائیں

۷۱

جب رونا آوے مُسکائیں
جب دل ٹوٹے دیپ جلائیں
پریم کتھا کا انت نہ کوئی
کتنی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی ساجن
کچھ نہیں مانگیں، سب کچھ پائیں
فیضؔ اُن سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

ایک ترانہ

پنجابی کسان کے لیے

۴۷
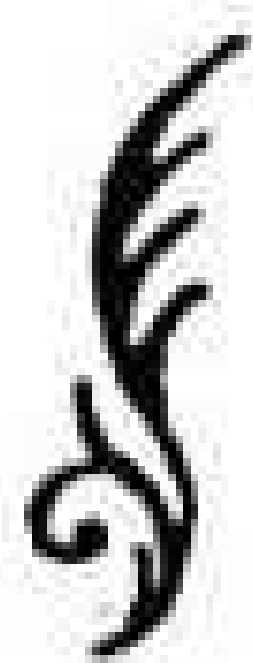
اُٹھ اُتاں نوں جٹّا
مردا کیوں جائیں
بھولیا! توں جگ دا اَن داتا
تیری باندی دھرتی ماتا
توں جگ دا پالن ہار
تے مردا کیوں جائیں
اُٹھ اُتاں نوں جٹّا
مردا کیوں جائیں

۷۵

جرنل، کرنل، صوبیدار
ڈپٹی، ڈی سی، تھانیدار
سارے تیرا دِتّا کھاون
توں جے نہ بیجیں، توں جے نہ گاہویں
بھکّھے، بھانے سب مرجاون
ایہہ چاکر توں سرکار
مردا کیوں جائیں
اُٹھ اُتاں نوں جٹّا
مردا کیوں جائیں

وِچ کچہری، چونکی تھانے
کیہہ اَن بھول تے کیہہ سیانے
کیہہ اشراف تے کیہہ نمانے

سارے کھجل خوار
مرداکیوں جائیں
اُٹھ اُتاں نوں جٹا

ایکا کرلئو، ہو جاؤ کٹھے
بُھل جاؤ رانگڑ، چیمے، چٹھے
سبھے دااک پریوار
مرداکیوں جائیں

جے چڑھ آون فوجاں والے
توں وی چھویاں لمب کرالے
تراحق تری تلوار
تے مرداکیوں جائیں
دے اللہ ہُو دی مار
تے مرداکیوں جائیں

ایک نغمہ

تارکینِ وطن کے لیے
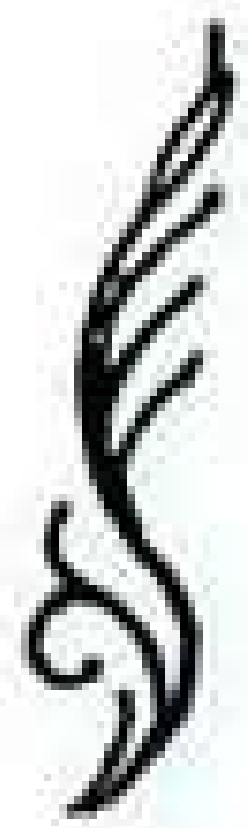
"ڈُھلنے دیاں ٹھنڈیاں چھائیں او یار
ٹِک رَہو تھائیں او یار"
روزی دیوے گا سائیں او یار
ٹِک رَہو تھائیں او یار

ہیر نوں چھڈ ٹُر گیوں رنجھیٹے
کھیڑیاں دے گھر پے گئے ہاسے
کانگ اُڈاون ماواں، بھیناں
ترلے پادن لکھ ہزاراں

نیلی بار کا پرانا گیت

پِنڈ وچ کڈی ٹُوہر شریکاں
یاراں دے ڈھے پئے منڈاسے
ویراں دیاں ٹُٹ گیّاں بائیں
او یار

ٹِک روتھائیں او یار
روزی دیوے گا سائیں
کانگ اُڈاون ماواں، بھیناں
ترلے پاون لکھ ہزاراں
خیر مناون سنگی ساتھی
چرخے اولے رووَن مٹیاراں
ہاڑاں کردیاں سُنجیاں راہیں
او یار

ٹِک رَو تھائیں او یار

وطنے دیاں ٹھنڈیاں چھائیں

چھڈ غیراں دے محل چو محلے

اپنے ویہڑے دی ریس نہ کائی

اپنی جھوک دیاں سَتّے خیراں

بِیبا تُس نے قدر نہ پائی

موڑ مہاراں

تے آ گھر باراں

مُڑ آ کے مُول نہ جائیں

او یار

ٹِک رو تھائیں او یار

غُبارِ ایّام

ہر کُجا رفتم غُبارِ زندگی درپیش بود
یارب ایں خاکِ پریشاں از کُجا برداشتم

(بیدل)

تم ہی کہو کیا کرنا ہے

جب دکھ کی ندیا میں ہم نے

جیون کی ناؤ ڈالی تھی

تھا کتنا کس بل بانہوں میں

لوہو میں کتنی لالی تھی

یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے

اور ناؤ پورم پار لگی،

ایسا نہ ہُوا، ہر دھارے میں

کچھ اَن دیکھی منجدھاریں تھیں

کچھ مانجھی تھے انجان بہت

کچھ بے پرکھی پتواریں تھیں

اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
ندیا تو وہی ہے ناؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
اب کیسے پار اترنا ہے

جب اپنی چھاتی میں ہم نے
اس دیس کے گھاؤ دیکھے تھے
تھا ویدوں پر وشواش بہت
اور یاد بہت سے نسخے تھے
یوں لگتا تھا بس کچھ دن میں
ساری بپتا کٹ جائے گی
اور سب گھاؤ بھر جائیں گے
ایسا نہ ہوا کہ روگ اپنے
کچھ اتنے ڈھیر پرانے تھے

غبارِ ایام

۵

ویدان کی توڑ کو پا نہ سکے
اور ٹوٹکے سب بیکار گئے
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
چھاتی تو وہی ہے گھاؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
یہ گھاؤ کیسے بھرنا ہے

لندن ۱۹۸۱ء

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

دار کی رسیوں کے گلوبند گردن میں پہنے ہُوئے
گانے والے ہر اِک روز گاتے رہے
پایلیں بیڑیوں کی بجاتے ہُوئے
ناچنے والے دُھومیں مچاتے رہے
ہم نہ اِس صف میں تھے اور نہ اُس صف میں تھے
راستے میں کھڑے اُن کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے
اور چُپ چاپ آنسو بہاتے رہے

لَوٹ کر آ کے دیکھا تو پھُولوں کا رنگ
جو کبھی سُرخ تھا زرد ہی زرد ہے

اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
گلو میں کبھی طوق کا واہمہ
کبھی پاؤں میں رقصِ زنجیر
اور پھر ایک دن عشق انھیں کی طرح
رُسن در گلو، پا بجولاں ہمیں
اسی قافلے میں کشاں لے چلا

بیروت - جولائی ۱۹۸۱ء

○
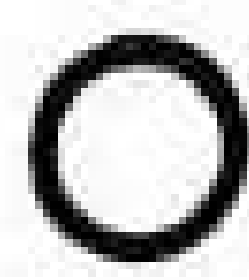
نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسّر تو آرزو ہی سہی

نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے، بے وضو ہی سہی

کسی طرح تو جمے بزم میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی

گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیض ذکرِ وطن اپنے رُو برُو ہی سہی

لاہور۔ فروری ۱۹۸۲ء

میجر اسحاق کی یاد میں

لو تم بھی گئے ہم نے تو سمجھا تھا کہ تم نے
باندھا تھا کوئی یاروں سے پیمانِ وفا اور
یہ عہد کہ تا عمرِ رواں ساتھ رہو گے
رستے میں بچھڑ جائیں گے جب اہلِ صفا اور
ہم سمجھے تھے صیّاد کا ترکش ہُوا خالی
باقی تھا مگر اس میں ابھی تیرِ قضا اور
ہر خار رہِ دشتِ وطن کا ہے سوالی
کب دیکھیے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور
آنے میں تامّل تھا اگر روزِ جزا کو
اچھا تھا ٹھہر جاتے اگر تم بھی ذرا اور

بیروت - ۳ر جون ۸۲ء

اب ان کے رنگیں پرتو سے
اس شہر کی گلیاں روشن ہیں
اور تاباں ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
ہر ویراں گھر، ہر ایک کھنڈر
ہم پایۂ قصرِ دارا ہے
ہر غازی رشکِ اسکندر
ہر دختر ہمسرِ لیلیٰ ہے
یہ شہر ازل سے قائم ہے
یہ شہر ابد تک دائم ہے
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں

بیروت۔ جون ۸۲ء

ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے

بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں
بچوں کی ہنستی آنکھوں کے
جو آئنے چکنا چور ہوئے
اب ان کے ستاروں کی لَو سے
اس شہر کی راتیں روشن ہیں
اور رُخشاں ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
جو چہرے لہو کے غازے کی
زینت سے سوا پُرنور ہوئے

قَد جاء الحقُّ وَ زَہق البَاطِل

فرمودۂ ربِّ اکبر

ہے جنّت اپنے پاؤں تلے

اور سایۂ رحمت سر پر ہے

پھر کیا ڈر ہے

ہم جیتیں گے
حقّا ہم اِک دن جیتیں گے
بالآخر اِک دن جیتیں گے

بیروت۔ ۱۵ جون ۸۲ء

غُبارِ ایام

۱۴

○
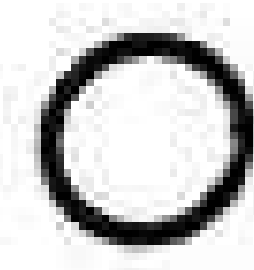
گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دِوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا

منزل کو نہ پہچانے رہِ عشق کا راہی
ناداں ہی سہی ایسا بھی سادہ تو نہیں تھا

تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

واعظ سے رہ و رسم رہی رند سے صحبت
فرق ان میں کوئی اتنا زیادہ تو نہیں تھا

فروری ۲۰۰۳ء

اِس وقت تو یُوں لگتا ہے

اِس وقت تو یُوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سُورج ، نہ اندھیرا نہ سویرا

آنکھوں کے دریچوں پہ کسی حُسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا

ممکن ہے کوئی وہم تھا ، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اِک آخری پھیرا

شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا

اِک بَیر، نہ اِک مہر، نہ اِک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا، نہ پرایا کوئی میرا

مانا کہ یہ سُنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اِک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو، جینے کو تو اِک عمر پڑی ہے

میو ہسپتال - لاہور
۴ر مارچ ۸۲ء

○
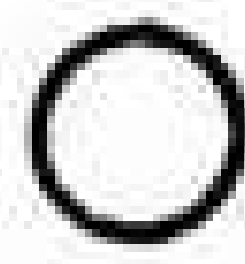
دربار میں اب سطوتِ شاہی کی علامت
درباں کا عصا ہے کہ مصنّف کا قلم ہے

آوارہ ہے پھر کوہِ ندا پر جو بشارت
تمہیدِ مسرّت ہے کہ طولِ شبِ غم ہے

جس دھجّی کو گلیوں میں لیے پھرتے ہیں طفلاں
یہ میرا گریباں ہے کہ لشکر کا علَم ہے

جس نور سے ہے شہر کی دیوار درخشاں
یہ خونِ شہیداں ہے کہ زر خانۂ جم ہے

حلقہ کیے بیٹھے رہو اِک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

آج پھر دردِ و غم کے دھاگے میں
ہم پرو کر ترے خیال کے پھول

ترکِ اُلفت کے دشت سے چُن کر
آشنائی کے ماہ و سال کے پھول

تیری دہلیز پر سجا آئے
پھر تری یاد پر چڑھا آئے

باندھ کر آرزو کے پلّے میں
ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

یہ کس دیارِ عدم میں ...

نہیں ہے یُوں تو نہیں ہے کہ اب نہیں پیدا
کسی کے حسن میں شمشیرِ آفتاب کا حسن
نگاہ جس سے ملاؤ تو آنکھ دُکھنے لگے
کسی ادا میں ادائے خرامِ بادِ صبا
جسے خیال میں لاؤ تو دل سُلگنے لگے
نہیں ہے یوں تو نہیں ہے کہ اب نہیں باقی
جہاں میں بزم گہِ حسن و عشق کا میلا
بنائے لطف و محبت، رواجِ مہر و وفا
یہ کس دیارِ عدم میں مقیم ہیں ہم تم
جہاں پہ مژدۂ دیدارِ حسنِ یار تو کیا
نویدِ آمدِ روزِ جزا نہیں آتی
یہ کس خمار کدے میں ندیم ہیں ہم تم
جہاں پہ شورشِ رندانِ میگسار تو کیا
شکستِ شیشۂ دل کی صدا نہیں آتی

(ناتمام)

نذرِ مولٰنا حسرتؔ موہانی

مر جائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے
احرار کبھی ترکِ روایت نہ کریں گے

کیا کچھ نہ ملا ہے جو کبھی تجھ سے ملے تھے
اب تیرے نہ ملنے کی شکایت نہ کریں گے

شب بیت گئی ہے تو گزر جائے گا دن بھی
ہر لحظہ جو گزری وہ حکایت نہ کریں گے

یہ فقر دلِ زار کا عوضانہ بہت ہے
شاہی نہیں مانگیں گے ولایت نہ کریں گے

ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

○
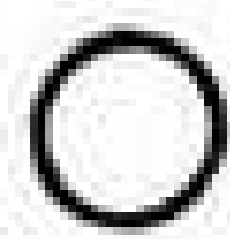
ہم مسافر یونہی مصروفِ سفر جائیں گے
بے نشاں ہو گئے جب شہر تو گھر جائیں گے

کس قدر ہو گا یہاں مہر و وفا کا ماتم
ہم تری یاد سے جس روز اتر جائیں گے

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گہر جائیں گے

نعمتِ زیست کا یہ قرض چکے گا کیسے
لاکھ گھبرا کے یہ کہتے رہیں مر جائیں گے

شاید اپنا بھی کوئی بیت حُدی خواں بن کر
ساتھ جائے گا مرے یار جدھر جائیں گے

فیض آتے ہیں رہِ عشق میں جو سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

—

○
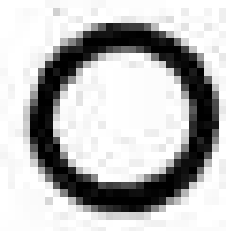
جیسے ہم بزم ہیں پھر یارِ طرحدار سے ہم
رات ملتے رہے اپنے در و دیوار سے ہم

سرخوشی میں یونہی دل شاد و غزل خواں گزرے
کوئے قاتل سے کبھی کوچۂ دلدار سے ہم

کبھی منزل، کبھی رستے نے ہمیں ساتھ دیا
ہر قدم اُلجھے رہے قافلہ سالار سے ہم

ہم سے بے بہرہ ہوئی اب جرسِ گل کی صدا
ورنہ واقف تھے ہر اک رنگ کی جھنکار سے ہم

فیض جب چاہا جو کچھ چاہا سدا مانگ لیا
ہاتھ پھیلا کے دلِ بے زر و دینار سے ہم

جو میرا تمھارا رشتہ ہے

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمھارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدمِ مہ و سال
اس عشقِ خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
"گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے"

آج شب کوئی نہیں ہے

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
آنکھ سے دور طلسمات کے در وا ہیں کئی
خواب در خواب محلّات کے در وا ہیں کئی
اور مکیں کوئی نہیں ہے،
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
"کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت"
کوئی امّید، کوئی آس مسافر صورت
کوئی غم، کوئی کسک، کوئی شک، کوئی یقیں
کوئی نہیں ہے

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
تم اگر ہو، تو مرے پاس ہو یا دُور ہو تم
ہر گھڑی سایہ گرِ خاطرِ رنجور ہو تم
اور نہیں ہو تو کہیں — کوئی نہیں، کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے،

—

شام دُھندلانے لگی اور مری تنہائی
دل میں پتھر کی طرح بیٹھ گئی
چاند اُبھرنے لگا یکبار تری یاد کے ساتھ
زندگی مونس و غمخوار نظر آنے لگی

باقی ہے کوئی ساتھ تو بس ایک اسی کا
پہلو میں لیے پھرتے ہیں جو درد کسی کا
اِک عمر سے اس دُھن میں کہ اُبھرے کوئی خورشید
بیٹھے ہیں سہارا لیے شمعِ سحری کا

ترک شاعر ناظم حکمت کے افکار

جینے کے لیے مرنا
یہ کیسی سعادت ہے
مرنے کے لیے جینا
یہ کیسی حماقت ہے

—

اکیلے جیو
ایک شمشاد تن کی طرح
اور مل کر جیو
ایک بن کی طرح

—

ہم نے امّید کے سہارے پر
ٹوٹ کر یوں ہی زندگی کی ہے
جس طرح تم سے عاشقی کی ہے

—

اِدھر نہ دیکھو

اِدھر نہ دیکھو کہ جو بہادر
قلم کے یا تیغ کے دھنی تھے
جو عزم و ہمّت کے مُدّعی تھے
اب ان کے ہاتھوں میں صدق ایماں کی
آزمودہ پُرانی تلوار مُڑ گئی ہے
جو کج کُلہ صاحبِ حشم تھے
جو اہلِ دستار محترم تھے
ہوس کے پُر پیچ راستوں میں
کُلہ کسی نے گرو رکھ دی
کِسی نے دستار بیچ دی ہے

اُدھر بھی دیکھو

جو اپنے رُخشاں لہو کے دینار
مُفت بازار میں لُٹا کر
نظر سے اوجھل ہوئے
اور اپنی لحد میں اِس وقت تک غنی ہیں،
اُدھر بھی دیکھو
جو حرفِ حق کی صلیب پر اپنا تن سجا کر
جہاں سے رخصت ہوئے
اور اہلِ جہاں میں اس وقت تک نبی ہیں

○
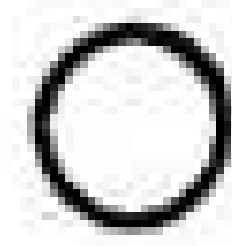
رفیقِ راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد
چھٹا یہ ساتھ تو رہ کی تلاش بھی نہ رہی
ملول تھا دلِ آئنہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا اِک خراش بھی نہ رہی

○

پھر آئینۂ عالم شاید کہ نکھر جائے
پھر اپنی نظر شاید تا حدِ نظر جائے

صحرا پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن پر
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے

خاکِ رہِ جاناں پر کچھ خوں تھا گرَو اپنا
اس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اُتر جائے

دیکھ آئیں چلو ہم بھی جس بزم میں سُنتے ہیں
جو خندہ بلب آئے وہ خاک بسر جائے

یا خوف سے در گزریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے اک بات ٹھہر جائے

۲۱۔ نومبر ۱۹۸۴ء

—— اِنتہا ——

بدل دردے کزاں شیریں شمائل داشتم گفتم

گزشتم از سرِ خود ہرچہ در دل داشتم گفتم

○

پھر آئنۂ عالم شاید کہ نکھر جائے
پھر اپنی نظر شاید تا حدِّ نظر جائے

صحرا پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن پر
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے

خاکِ رہِ جاناں پر کچھ خوں تھا گرو اپنا
اس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اُتر جائے

دیکھ آئیں چلو ہم بھی جس بزم میں سنتے ہیں
جو خندہ بلب آئے وہ خاک بسر جائے

یا خوف سے در گزریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے اک بات ٹھہر جائے

۲۱ - نومبر ۱۹۸۳ء

○

پھول مسلے گئے فرشِ گلزار پر
رنگ چھڑکا گیا تختۂ دار پر
بزم برپا کرے جس کو منظور ہو
دعوتِ رقص تلوار کی دھار پر
دعوتِ بیعتِ شہ پہ ملزم بنا
کوئی اقرار پر، کوئی انکار پر

(ناتمام) ۲۲ر فروری، ۸۴ء

○
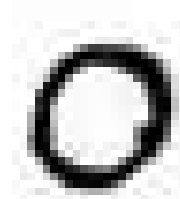
بے بسی کا کوئی درماں نہیں کرنے دیتے
اب تو ویرانہ بھی ویراں نہیں کرنے دیتے
دل کو صد لخت کیا سینے کو صد پارہ کیا
اور ہمیں چاک گریباں نہیں کرنے دیتے
ان کو اسلام کے لٹ جانے کا ڈر اتنا ہے
اب وہ کافر کو مسلماں نہیں کرنے دیتے
دل میں وہ آگ فروزاں ہے عدو جسکا بیاں
کوئی مضمون کسی عنواں نہیں کرنے دیتے
جان باقی ہے تو کرنے کو بہت باقی ہے
اب وہ جو کچھ کہ مری جاں نہیں کرنے دیتے

۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۲ء

○
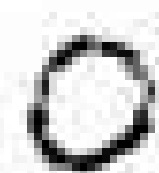
بہت ملا نہ ملا زندگی سے غم کیا ہے
متاعِ دردِ بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے

ہم ایک عمر سے واقف ہیں اب نہ سمجھاؤ
کہ لطف کیا ہے مرے مہرباں ستم کیا ہے

کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مصرف
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشمِ نم کیا ہے

لحاظ میں کوئی کچھ دور ساتھ چلتا ہے
وگرنہ دہر میں اب خضر کا بھرم کیا ہے

اجل کے ہاتھ کوئی آ رہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے

سجاؤ بزم، غزل گاؤ، جام تازہ کرو
"بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے"

نومبر ۸۰ء

شامِ غُربت

دشت میں سوختہ سامانوں پہ رات آئی ہے
غم کے سُنسان بیابانوں پہ رات آئی ہے
نُورِ عرفان کے دیوانوں پہ رات آئی ہے
شمعِ ایمان کے پروانوں پہ رات آئی ہے
بَیتِ شبّیر پہ ظُلمت کی گھٹا چھائی ہے
درد سا درد ہے تنہائی سی تنہائی ہے
ایسی تنہائی کہ پیارے نہیں دیکھے جاتے
آنکھ سے آنکھ کے تارے نہیں دیکھے جاتے
درد سے درد کے مارے نہیں دیکھے جاتے
ضُعف سے چاند ستارے نہیں دیکھے جاتے
ایسا سنّاٹا کہ شمشانوں کی یاد آتی ہے
دِل دھڑکنے کی بہت دُور صدا جاتی ہے

نعت

اے تو کہ ہست ہر دلِ محزوں سرائے تو
آوردہ ام سرائے دِگر از برائے تو

خواجہ بہ تختِ بندۂ تشویشِ مُلک و مال
بر خاک رشکِ خسرِو دوراں گدائے تو

آنجا قصیدہ خوانیِ لذّاتِ سیم و زر
اِینجا فقط حدیثِ نشاطِ لقائے تو

آتش فشاں ز قہر و ملامت زبانِ شیخ
از اشک تر ز درد غریبانِ ردائے تو

باید کہ ظالمانِ جہاں را صدا کُند
روزے بسُوئے عدل و عنایت صدائے تو

—— اِنتہا ——

بدل دردے کزاں شیریں شمائل داشتم گفتم

گزشتم از سرِ خود ہر چہ در دل داشتم گفتم

"عہد حاضر کے شاعروں میں فیض تنہا شاعر ہے جو اپنے تصورات سے خالص حُسن کا ایک دلکش بہشت پیدا کرنا چاہتا ہے، لیکن جس نے حُسن اور رومان کے سنہری پردوں کے اس پار حقیقت کی ایک جھلک بھی دیکھ لی ہے۔"

— ن ۔ م ۔ راشد

"فیض کی شاعری میں انگریزی ادب کے ایک خوشگوار اثر، جدید انسان کے ذہن، اور ایشیائی تہذیب کے قابلِ قدر عناصر کی ایک قوسِ قزح جلوہ گر ہے۔"

— پروفیسر آل احمد سرور

"فیض کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کے خیالات کی سنجیدگی، شخصیت کا توازن اور شعری اعتدال ہے۔"

— ڈاکٹر جمیل جالبی

نسخہ ہائے وفا (کلیات) میں ذیل کے تمام دواوین کا کلام شامل ہے۔

(۱) نقشِ فریادی
(۲) دستِ صبا
(۳) زنداں نامہ
(۴) دستِ تہِ سنگ
(۵) سرِ وادیِ سینا
(۶) شامِ شہرِ یاراں
(۷) مرے دل مرے مسافر
(۸) غبارِ ایام (غیر مطبوعہ)

نسخہ ہائے وفا